نگار

1996 IST

U
OTO
N65N-6(61)
1956

سالانہ چندہ ہندوستان و پاکستان
آٹھ روپیہ چھ آنہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتح پوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد ایڈیشن غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ للہ (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا' ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے' اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے صرف (علاوہ محصول)

من و یزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک خیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے' جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشائیاں اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے صرف (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) الہام (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۲۰ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت صرف

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے' قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں قحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ قحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی' نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ للہ

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گمشدہ فلاسفہ قدیم کی سوانح کے ساتھ (۲) مادیین کا مذہب' نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کا آیندہ سالنامہ ۵۷ء

(اصنافِ سخن نمبر)

ہر آنے والے سال کے ساتھ ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ نگار کا مخصوص نمبر کس موضوع کے لئے وقف کیا جائے جو پڑھنے والوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مُفید ہو اور جس کی ترتیب میں اُردو کے اہم لکھنے والے حصّہ لے سکیں، چنانچہ موجودہ انتقادی دور کے پیشِ نظر یہ مناسب سمجھا گیا کہ ۱۹۵۷ء کا پہلا شمارہ اُردو شاعری کے تمام اہم اصنافِ سخن کی تعریف، تجزیہ، تشریح اور تاریخ کے لئے وقف ہو۔

یہ سالنامہ طلبہ، اساتذہ اور تمام شایقین ادب اُردو کے لئے ایک نہایت مفید دائرۃ المعارف قسم کی چیز ہوگا، جس کی اہمیت کا اندازہ آپ کو ذیل کے عنوانات سے بخوبی ہو سکتا ہے :-

صنف غزل :- (۱) غزل کی ماہیت اور ہیئت - (۲) اُردو غزل ولی سے غالب تک - (۳) اُردو غزل غالب سے عہدِ حاضر تک - (۴) دہلی اور لکھنؤ کا دبستانِ تغزل - (۵) غزل کا مستقبل۔

صنف قصیدہ :- (۱) قصیدہ کی تاریخی و روایتی حیثیت - (۲) قصیدہ کا ارتقائی دور۔ (۳) ذوق، سودا، غالب و مومن کی قصیدہ نگاری۔

صنف مثنوی :- (۱) مثنوی کی روایتی و بنیادی خصوصیات - (۲) دکن کی مثنویاں - (۳) مثنوی تاریخی نقطۂ نظر سے (۴) لکھنؤ، دہلی کی مشہور مثنویاں۔

صنف مرثیہ :- (۱) مرثیہ کے عناصر ترکیبی - (۲) دکن اور مرثیہ نگاری - (۳) مرثیہ انیس تک۔ (۴) مرثیہ انیس کے بعد (۵) انیس و دبیر - (۶) واقعۂ کربلا کے علاوہ دوسرے مراثی۔

صنف رُباعی و قطعات :- (۱) رُباعی پر تاریخی نظر - (۲) اُردو کے مشہور رُباعی نگار - (۳) قطعہ نگاری کا سرسری جایزہ

صنف ہجو و مزاح نگاری :- (۱) ہجو نگاری (تاریخی جایزہ) - (۲) سودا بہ حیثیت ہجو نگار - (۳) مزاحیہ و ظریفانہ شاعری

صنف ریختی :- (۱) اُردو ریختی پر ایک نظر۔

صنف نظم نگاری :- (۱) اُردو کی ابتدائی نظمیں - (۲) جدید نظم نگاری کا پس منظر - (۳) اخلاقی و اصلاحی نظمیں۔ (۴) رومانی نظمیں - (۵) سیاسی و انقلابی نظمیں - (۶) آزاد نظم - (۷) فلمی نظمیں اور گیت۔

پروفیسر فراق - پروفیسر مجنوں - پروفیسر سرور - پروفیسر احتشام حسین - پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین - پروفیسر ڈاکٹر محمد عقیل - پروفیسر ڈاکٹر ضیاء احمد بدایونی - ڈاکٹر گیان چند - مولانا اختر علی تلہری - حضرت اثر لکھنوی - پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں - پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن - پروفیسر ڈاکٹر صفدر حسین کے خطوط مل گئے ہیں اور ان حضرات نے ازراہِ کرم لکھنا شروع کر دیا ہے۔

منیجر نگار

چند ضروری اعلانات

"نگار" کی آیندہ اشاعت جولائی سے

"کلام غالب" کے زیر عنوان اڈیٹر نگار کے قلم سے ایک مستقل کتاب کا آغاز ہوگا، جس میں پہلے غالب کے اُردو کلام کی شرح و تفسیر پیش کی جائے گی اور اس کے بعد فارسی کلام کی - اس میں بتایا جائے گا کہ غالب کے سمجھنے میں اس وقت تک کس حد تک افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے اور دُنیائے شاعری میں غالب کا صحیح موقف کیا ہے۔

اس اشاعت میں بعض اور نہایت اہم مضامین شایع ہو رہے ہیں مثلاً :- حالی و شبلی کی سوانح نگاری کا تقابلی مطالعہ مکتوبات نیاز پر ایک مفصل تبصرہ - غالب کا طرز سخن گوئی - یاد پاستین - وغیرہ وغیرہ

پاکستان کے خریدار

اپنا سالانہ چندہ ۸ مثے ذیل کے پتہ پر ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس جلد از جلد بھیجدیں تاکہ پرچہ کی روانگی میں تاخیر نہ ہو - پاکستان کے بعض خریدار کا چندہ جون یا اس سے قبل ختم ہو چکا ہے اور ان کے نام جولائی کا پرچہ اسی وقت روانہ ہوگا جب اُن کا چندہ وصول ہو جائے گا۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی — ۱۰۵ — گارڈن ویسٹ کراچی

"نگار" کی مطبوعات بھی آپ کو اس پتہ سے ذریعہ وی - پی مل سکتی ہیں۔

چندہ سالانہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کرنے میں آپ کو ۹ر کا فایدہ ہے کیونکہ رجسٹری کی فیس بڑھ جانے کی وجہ سے "نگار" کا سالانہ وی، پی اب ۹ مثے میں روانہ ہوگا اور آپ کو ۱۱ مثے ادا کرنا پڑیں گے - جو حضرات سالنامہ ذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں وہ ۸ر زیادہ روانہ فرمائیں۔

منیجر نگار - لکھنؤ

بعض کمیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا قیمتیں علاوہ محصولڈاک ہیں)

کشاف اصطلاحات الفنون ... شیخ محمد علی ... عنہ ۲۰ر
جہانگیر نامہ ..... خواجہ ابوالحسن ۸ر
آئین اکبری مصور سہ حصص - ابوالفضل فیضی ... مغہ ۶ر
سکندر نامہ مصور ... مولوی نظامی گنجوی ... ۸ر
وقایع نعمت خان عالی انشائے حسن وعشق ... ۸ر
درۂ نادرہ ..... مرزا محمد مہدی خاں ..... عنہ ۱۰ر
تاریخ گلستانِ ہند مصور ... درگا پرشاد ..... عنہ ۲۰ر
تاریخ جامع التواریخ ... فقیر محمد ..... صہ ۱۵ر
اقبال نامہ جہانگیری سہ حصہ محمد شریف معتمد خاں ... ۶۰ر
سیر المتاخرین سہ حصہ .. غلام حسین خاں ..... لغہ ۴۰ر
تذکرہ دولت شاہ - دولت شاہ سمرقندی .... عنہ ۱۰ر
دربار اکبری .. آزاد ..... عنہ ۲۰ر
تذکرہ گل رعنا ..... عبدالغنی ..... صہ ۱۵ر
کلیات ظہیر ..... حکیم ظہیر فاریابی ۸ر
قصاید عرفی مجتبیٰ ... جمال الدین ۸ر
کلیات اسمٰعیل ... اسماعیل اصفہانی .... صہ ۱۵ر
کلیات سعدی .... شیخ مصلح الدین سعدی ... صہ ۱۵ر
دیوان عرفی ..... جمال الدین عرفی ۵ر
دیوان ہلالی مجتبیٰ ... ہلالی ۵ر
دیوان قصاید عنصری ... حکیم ابوالقاسم ۸ر
تذکرہ کاملانِ رام پور ... احمد علی خاں ..... عنہ ۱۰ر
تذکرہ آبِ بقا ..... عبدالرؤف عشرت ۵ر
ہندو شعراء ..... " ..... للغہ ۴۰ر
تذکرۃ الخواتین ... عبدالباری آسی ۲۰ر
تذکرہ سخن شعرا نساخ ..... عنہ ۲۰ر
تذکرہ گلشنِ ہند ... مرزا علی لطف ..... عنہ ۲۰ر

تذکرہ مخزن نکات ... قائم ۵ر
تذکرہ دستور الفصاحت ... یکتا ۲ر
تذکرہ چمنستان شعراء ... شفیق ..... صہ ۱۵ر
تذکرہ ہندی ..... مصحفی ..... صہ ۱۵ر
دیوان میر حسن ... میر حسن حسن ۳ر
دیوان شگرف ... دیوان نسیم دہلوی ... محمد اصغر علی خاں .. عنہ ۲۰ر
کلیات ناسخ ... امام بخش ناسخ ..... عنہ ۱۰ر
کلیات تسلیم ۸ر
کلیات سودا ... مرزا رفیع سودا ..... عنہ ۱۰ر
کلیات حسرت ... فضل الحسن موہانی ۸ر
کلیات مومن ... مومن خاں دہلوی ..... عنہ ۱۰ر
کلیات میر ... میر تقی میر ..... عنہ ۲۰ر
مکمل شرح کلام غالب .. مرتبہ عبدالباری آسی ... عنہ ۱۰ر
مراۃ الغیب ... امیر احمد امیر ۸ر
مظہر معانی دیوان مجروح ... میر مہدی حسین ۸ر
دستور الشعراء (تذکیر و تانیث) ۲ر
کلیات جعفر زٹلی ... مرتبہ محمد فرحت اللہ ۲ر
کلیات نظیر اکبرآبادی .. مرتبہ عبدالباری آسی .... عنہ ۲۰ر
مراثی میر انیس .. جلد اول و دوم و سوم و چہارم - میر انیس - صہ ۵۰ر
مراثی میر انیس .. جلد ششم - مرتبہ میر عبدالحسین .. عنہ ۲۰ر
مراثی دبیر کامل ..... صہ ۳۵ر
مراثی مونس ۵ر
کریم اللغات ۵ر
تنقیح اللغات ... ضامن علی جلال لغت قلمی ... صہ ۱۵ر
فردوسی پر چار مقالے .. محمود شیرانی ..... عنہ ۱۰ر
تاریخ حبیب السیر - غیاث الدین بن ہمام الدین ... ۶۰ر

پاکستان میں یہ کتابیں صرف اس صورت سے پہونچ سکتی ہیں کہ پوری قیمت مع محصولڈاک ذریعہ بنک ڈرافٹ پہلے وصول ہو جائے۔

منیجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ جون میں ختم ہوگیا اور جولائی کا نگار کے مصارف رجسٹری کے لئے ۸ر اس کے علاوہ ہوں گے

نگار

آٹھ روپیہ نو آنے میں وی۔پی ہوگا۔ سالنامہ ۵۷ء

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۹ | فہرست مضامین جون ۵۶ء | شمار ۶

ملاحظات ۴
اثر لکھنوی (اپنے خطوط کے آئینے میں) .. نثار احمد فاروقی ... ۶
قدیم تذکرے ۱۳
عرش کی شاعری .... عبدالحئی خاں سیوراوی ... ۱۷
قانونِ تجاذب ۲۵
کچھ "ذوقِ جنوں" کے بارے میں ... نظیر صدیقی ... ۳۱
روایت و درایت .... وقار احمد رضوی ۳۹
علی گڑھ کے دور اولیں کی ایک عجیب شخصیت ... سبط محمود فاروقی .. ۴۲
دُنیا کا سب سے زیادہ خطرناک کھیل ۴۸
منظومات :- فضا ابن فیضی - سحر بھوپالی - عزیز - ہلال صدیقی - غنی اعظمی ۵۱
مطبوعات موصولہ ۵۴

ملاحظات

پاکستان کا موجودہ دور کشمکش

پاکستان میں مسلم لیگ اور ریپبلکن پارٹی کی باہمی کشمکش اندیشہ ناک بھی ہے اور امید افزا بھی۔ اندیشہ اس بات کا کہ اگر آیندہ انتخاب میں مسلم لیگ کو اکثریت حاصل ہوگئی تو پچھلا آٹھ سال کا ناکام دورِ اقتدار پھر قایم ہوجائے گا اور امید اس بات کی کہ اگر ریپبلکن پارٹی نے مسلم لیگ کو شکست دیدی تو ممکن ہے یہ نیا تجربہ کچھ نئی برکتیں بھی اپنے ساتھ لائے اور پاکستان کو کوئی صحیح راہِ عمل قایم کرسکے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ پچھلے ۸ سال کی تاریخ پاکستان، اقتدار مسلم لیگ کی داستان ہے اور اس اقتدار نے کوئی یادگار ایسی قایم نہیں کی کہ ملک اس پر فخر کرسکے یا اہل ملک کو اس کے ختم ہونے پر افسوس ہو، اس لئے ہوسکتا ہے کہ اس حقیقت کے پیش نظر وہاں کے عوام کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو اور وہ یہ سمجھ کر کہ اس وقت تک جو راہ انھوں نے اختیار کی تھی صحیح نہ تھی، وہ کوئی دوسری راہ اختیار کریں، لیکن اگر وہ بدستور اسی روایت پر قایم رہے جو ایک شکست خوردہ مذہبی ذہنیت کی آخریں متوکلانہ جائے پناہ ہے تو یقیناً ریپبلکن پارٹی ناکام رہے گی۔ اور یہ ناکامی پاکستان کی وہ ناکامی ہوگی جس کی تلافی شاید قسام ازل کے بس کی بات بھی نہیں۔

ریپبلکن پارٹی، ڈاکٹر خان صاحب کی پارٹی ہے، جن کی قومی خدمات سے شاید ان کے حریف کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس وقت مغربی پاکستان کو ایک وحدت میں تبدیل کرنے کا خیال پیدا ہوا تو اس بوجھ کو سنبھالنے کے لئے افراد مسلم لیگ میں کسی فرد کا نام سامنے نہ آیا حالانکہ وہ سات سال سے حکومت کرتے چلے آرہے تھے بلکہ ڈاکٹر خان کا نام سامنے آیا جو سات سال سے قید و بند

کی زندگی گزار رہے تھے۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کے سمجھنے کے لئے قیام پاکستان کے بعد وہاں کے سیاسی پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ تقسیم ہند کے بعد سب سے پہلا سیاسی ردّ عمل وہاں یہ ہوا کہ نہ صرف مشرقی و مغربی پاکستان بلکہ خود مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں میں حصول اقتدار کے لئے کشمکش شروع ہوگئی اور چونکہ ذہنی، ثقافتی و اقتصادی حیثیت سے پنجاب اپنے آپ کو "شریکِ غالب" سمجھتا تھا، اس لئے رفتہ رفتہ وہ آگے بڑھنے لگا اور صوبۂ سرحد و سندھ میں اس کے خلاف وہی ریشہ دوانیاں ہونے لگیں جو احساس کمتری کی بنا پر ہر جگہ ہوا کرتی ہیں۔ اس بدمزگی کو دور کرنے کا یہ طریقہ سوچا گیا کہ صوبائی تقسیم ہی کو ختم کر دیا جائے اور پورے مغربی پاکستان کو ایک صوبہ قرار دیکر اسے ایک جغرافی وحدت بنا دیا جائے۔ لیکن اس جغرافی وحدت کے ساتھ ذہنی وحدت کا بھی سوال سامنے تھا اور اس کے لئے ضروری تھا کہ ذہنی طور پر "صوبۂ سرحد" کو بھی پنجاب کی سطح پر لے آیا جائے۔ چنانچہ اس مصلحت کے پیش نظر صوبۂ سرحد کے سب سے زیادہ زخم خوردہ لیکن بہت بڑے فرزند ڈاکٹر خان کو قید سے نکال کر نئے صوبہ کی عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں دیدی گئی پھر چونکہ وہ کانگریسی اصول کے آدمی ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کی متعین کی ہوئی راہیں اختیار نہ کر سکتے تھے اور ان کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ کوئی ایسی جماعت پیدا کریں جو اصول کانگریس اور صحیح جمہوریت سے قریب ہو اور اسی لئے انھوں نے مسلم لیگ کے خلاف ایک نئی جماعت ریپبلکن پارٹی کے نام سے قایم کی اور اس تلخ گھونٹ کو مرکزی حکومت اور چودھری محمد علی نے بھی حلق سے اُتار لیا، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ڈاکٹر خان صاحب کو ہٹا دیا گیا اور کسی مسلم لیگی کو یہ خدمت سپرد کی گئی تو صوبۂ سرحد کی پختونستانی تحریک ایک حقیقت ہو کر رہ جائے گی اور اندرونی کشمکش سخت خطرناک صورت اختیار کرلے گی۔

اس کے بعد جب دستور بن گیا اور آئینی مراحل سامنے آئے تو پھر وہی اکثریت و اقلیت کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا اور مسلم لیگ نے تمام قومی مصالح کو نظر انداز کر کے اسمبلی میں پھر اپنی اکثریت کے وزن پر ڈاکٹر خان کی سیادت سے نکلنے کی کوشش شروع کی اور اگر کاسٹنگ ووٹ ان کے خلاف نہ ہوتا تو وہ یقیناً کامیاب ہو جاتی پھر یونتو بظاہر ڈاکٹر خان صاحب کامیاب ہو گئے ہیں، لیکن کاسٹنگ ووٹ کی کامیابی دراصل کوئی کامیابی نہیں ہے اور ایک بہت بڑے موثر حزب مخالف کا مقابلہ ہے جس سے سر برہ ہونا آسان نہیں اور جب دوسری فیصلہ کن منزل عام انتخاب کی (غالباً جون میں) آئے گی تو کون کہہ سکتا ہے کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ریپبلکن پارٹی پھر تنکے کا سہارا لیکر ڈوبنے سے بچ جائے یا تنکے کو بھی اپنے ساتھ لیکر ڈوب جائے ۔ مشرقی پاکستان کی سیاست اس سے بھی زیادہ تشویشناک ہے، کیونکہ وہاں کے اقتصادی بحران نے تمام نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے اور عوام میں حکومت کی طرف سے بدگمانیاں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں یہاں تک کہ وہاں کی آئینی حکومت معطل ہو گئی اور گورنر راج قایم ہو گیا ہے جو یقیناً شگون نیک نہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ مشرقی بنگال کی ذہنیت اور مغربی پاکستان سے اسکی بے تعلقی و بیزاری نے جو پہلے بھی کچھ کم خطرہ نہ تھی، اب زیادہ اندیشہ ناک صورت اختیار کر لی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کس نوع کی انارکی کی صورت اختیار کرے۔

آجکل دُنیا میں کوئی حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک عوام اور جمہور کے جذبات اس کے ساتھ نہ ہوں، پھر اگر عوام کسی ایک ہی ذہن و خیال کے ہوں تو دشواری زیادہ نہیں ہوتی، لیکن جب خود ملک کے اندر متضاد خیال کی جماعتیں ایک دوسرے سے متصادم ہوں تو اس دشوار گزار منزل سے گزرنا حکومت کے لئے سخت دشوار ہو جاتا ہے اور حکومت پاکستان آج کل اسی خارزار سے گزر رہی ہے۔

بعض کا خیال ہے اور یہ خیال بالکل بے بنیاد نہیں کہ وہ وقت دور نہیں جب مشرقی بنگال، پاکستان سے اپنی علحدگی کا اعلان کر دے گا اور وہاں ایک اشتراکی قسم کی حکومت قایم ہوگی۔ اگر ایسا ہوا تو بات بہت دور پہنچ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ یہ اختلاف بین الاقوامی نزاع کی صورت اختیار کرلے جس سے نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان کو بھی اپنا دامن چھڑانا دشوار ہو جائے۔

اب سے کئی سال جب میں کراچی گیا ہوا تھا تو وہاں کے بعض سنجیدہ اہل رائے سے گفتگو کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ پاکستان مشرقی بنگال کی طرف سے بہت غیر مطمئن ہے یہاں تک کہ بعض ذمہ دار حضرات نے تو صاف صاف یہ بھی کہدیا کہ اگر ہم مشرقی پاکستان سے دست بردار ہو کر اپنی حالت کو سنبھال سکیں تو بھی یہ سودا گراں نہ ہوگا۔

سالنامہ ۵۶ء:۔ "اصناف سخن نمبر" کا اشتہار صفحہ (۱) پر ملاحظہ ہو

اثر لکھنوی

(اپنے خطوط کے آئینے میں)

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(نثار احمد فاروقی)

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۲۹ر نومبر ۱۹۵۳ء

پیارے بھائی فاروقی - میں نے میر کا مطالعہ کیا ہے، دقتِ نظر سے کیا ہے اور بار بار کیا ہے - میں اس کی تخیل اور اسلوبِ ادا کا گرویدہ ہوں - معتقد ہوں - میں نے اس کے کلام کی خصوصیات کو دریافت کرنا چاہا ہے مگر خود شعر کہتے وقت اس کے مطالب کو اپنے اشعار میں "دُہرانے" یا توڑ مڑوڑ کر اپنانے کی الحمدللہ کبھی کوشش نہیں کی - پُرخلوص مطالعہ اور پسند کا یہ فیض ہے کہ کبھی کبھی میرے کلام میں اس کے رنگ کی جھلک آجاتی ہے - غزل کے تنگ دائرے میں بہت کم مطالب کے اعتبار سے کہیں کہیں توارد ہوگیا ہو مگر میرے ذہن میں ایسا کوئی شعر نہیں - اپنا ایک مقطع نقل کرنا شاید بے محل نہ ہو:-

میں میر کا دم بھرتا ہوں اثرؔ میں اُس کے کلام کا شیدا ہوں
ہاں شعر تو تم کہہ لیتے وہ بول بنانا مشکل ہے

اصطلاح موسیقی میں بول بنانا اسی کو کہتے ہیں کہ مغنّی اصول فن میں کمال دکھانے کے بعد اپنے دل سے سامعہ نواز راہیں نکالتا ہے - اس غزل کے چند اشعار سنئے - اس میں بھی بول بنے ہیں یعنی میر کی اس خصوصیت کو میں نے سمجھا اور اپنایا ہے اور اس کے مطالب کو دُہرانا - لاواللہ!

آغازِ محبت کی لذّت انجام میں پانا مشکل ہے
جب دل کو مسوسے رہتے تھے اب ہاتھ لگانا مشکل ہے

طائر ہے نہ صیدِ وحشی ہے، دل ہے البتہ تڑپتا دل
دیکھو تو اِدھر کوشش تو کرو، کیا ایسا نشانا مشکل ہے

جو عشق کے فن میں ماہر ہیں اُن سے پوچھو تم کیا جانو
کب اشک بہانا مشکل ہے اور کب پی جانا مشکل ہے

کہنے کو تو ہم آزار کشیدہ، کہتے اُس کو کیا کیا کچھ
انصاف یہ ہے اس جور پہ بھی یوں دل کا لبھانا مشکل ہے

موسم اور وقت کی باتیں ہیں، راتیں ہیں نہ وہ برساتیں ہیں
رونے میں کبھی طوفان تھے اب دو اشک بہانا مشکل ہے

اندازِ بیاں میر کا ہے مگر خیالات میرے ہیں - ایک دو شعر اور سنئے:

پاؤں میں چھالے، راہ میں کانٹے، آنکھ تلے اندھیارا ہے
ڈوبتے دل کی آس نہ توڑو، ہار کے تم کو پکارا ہے

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں
جیسے کچھ اختیار ہے اپنا

تنقید میں بھی کسی نظرئے کا پابند نہیں - زیرِ نظر کلام کا مطالعہ کرتا ہوں - میرا ذوق کیا بلحاظِ مطالب، کیا بلحاظِ طرزِ ادا محاسن و معائب دریافت کرنے میں رہنمائی کرتا ہے - میں نے تنقید پر نہ معلوم کتنی کتابیں پڑھی ہیں اور اب بھی پڑھتا رہتا ہوں - مگر مقصود اپنی معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے نہ کہ تقلید - آپ نے میرے تنقیدی مضامین پڑھے ہیں - مجھے امید ہے کہ آپ نے محسوس کیا ہوگا

کہ کسی میں کوئی خاص ڈھرّا اختیار نہیں کیا گیا ہے - میں خاص طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ شاعر کا احساس موضوع کتنا گہرا اور حقیقت سے دست و گریباں ہے اور شاعر اپنے تاثرات کے اظہار میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے ۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کے تاثر کی سامع تک اُسی قوت سے تبلیغ ہوئی کہ نہیں - اس ضمن میں اُس کی زبان سے واقفیت اور ذخیرۂ الفاظ کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے - کیونکہ ناقص تبلیغ کا سبب یا تو زبان و بیان کی خامی ہوتی ہے یا سطحی اور نامکمل تاثر ہوتا ہے - میری تنقید میں میرے ذاتی ذوقِ شعری کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے - مثلاً میر کا مشہور قطعہ ہے:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا، یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

نظیر اکبر آبادی نے اسی خیال کو آٹھ نو اشعار میں نظم کیا ہے - ایک صاحب نے میر سے موازنے کے لئے نظیر کے قطعہ کا اس طرح اختصار کیا :-

ایک دن ایک استخواں اوپر پڑا میرا جو پاؤں کیا کہوں غفلت میں کیا کیا مجھ کو اس دم دھیان تھے
پاؤں پڑتے ہی غرض اس استخواں نے آہ کی اور کہا غافل کبھی ہم بھی تو صاحب جان تھے
ایسی بے دردی سے ہم پر پاؤں مت رکھ اے نظیر او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

اب میری تنقید ملاحظہ فرمائیے :- ایک مغرور و متکبر انسان کے کاسۂ سر میں چور چور ہونے پر بھی اُس کے لہجے کا تیکھا پن جو دوران حیات میں تھا قایم رکھتا اور شکستوں کو چین جبیں کی یادگار بنا کر اس کی زبان سے درس عبرت دینا، تخئیل کی وہ سحر کاریاں ہیں جس کی نظیر شاید ہی دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں ملے - یہ کاسۂ سر کچلے جانے پر نظیر کے پیش کردہ کاسۂ سر کی طرح آہ نہیں کرتا بلکہ ڈانٹ کر کہتا ہے کہ " دیکھ کے چل راہ بے خبر" اور صرف اس اظہار سے کہ " میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا" اپنی پامالیوں کو عبرت کا مرقع بنا دیتا ہے -

مجھے افسوس ہے کہ آپ کے استفسارات کا آپ کے حسب منشا جواب دینے سے معذور ہوں -

آپ کا اثر

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۲۵ر دسمبر ۱۹۵۳ء

پیارے بھائی فاروقی - میں اپنے پچھلے خط کے جواب کا منتظر رہا اور اسی طرح شاید آپ اپنے خط کے جواب کے منتظر ہیں - میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا - زہے قسمت کہ آپ کو یہ مطلع پسند آیا ؎

جس طرف نکل جاؤ بجلیاں ہیں تہمت سے عشق خانماں ویراں سب تری بدولت ہے

آپ کا اثر

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۵ر جنوری ۱۹۵۴ء

پیارے بھائی فاروقی - ۳۱ر دسمبر کا خط اور یکم جنوری کا پوسٹ کارڈ کل شام کو ایک ساتھ ملے - تمھارے لئے دل سے دعائیں نکلیں - اثرستان کا انتخاب بہاراں کے آخر میں شامل ہے - صفحہ ۳۵۳ - ۳۷۴ - اصل دیوان ۲۴ء میں شایع ہوا تھا - ڈھونڈونگا اگر کوئی کاپی مل گئی تو روانہ کردوں گا ورنہ شامل بہاراں انتخاب پر قناعت کرنا ہوگی - تازہ غیر مطبوعہ دیوان کے لئے کوئی اچھا سا نام تجویز کر دیجئے - میرے ذہن میں اب تک نو بہاراں اور جوہرستاں آئے ہیں -

آپ کا اثر

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۸ر جنوری ۱۹۵۴ء

پیارے بھائی فاروقی - پوسٹ کارڈ ملا - خط برابر بھیج رہا ہوں - تعجب ہے کہ آپ کو نہیں ملتے - جو شعر آپ کو پسند آیا وہ ہوا ہوں کا

نہیں اثرستاں کا ہے جس کا انتخاب صفحہ ۳۵۲ سے شروع ہوجاتا ہے۔ اس شعر کے پس منظر میں ایک عجیب وغریب واقعہ ہے جس کی طرف مقطع میں اشارہ ہے ؎

شعر آخر کہ ہے عطیۂ خاص　　اثر اعجازِ میرِ کامل تھا

اب اس کی تفصیل سنئے: غالباً ۱۹۲۱ء کا ذکر ہے۔ میرا تقرر کانپور میں بہ عہدۂ اکزیکیٹو افسر میونسپل بورڈ تھا۔ ایک مشاعرہ ہونے والا تھا۔ جس میں شرکت کے لئے لکھنؤ سے متعدد شعرائے کرام تشریف لائے تھے۔ میرے غریب خانہ میں فروکش تھے اس وقت جو نام یاد آتے ہیں وہ یہ ہیں:- عزیز، محشر، جوش ملیح آبادی، ذکی، شفیق (ننھو صاحب) منے آغا شرر۔ مشاعرہ دوسرے دن تھا۔ شب کی صحبت میں شعرخوانی کے ساتھ ساتھ مختلف اساتذہ متقدمین کے کلام پر بھی بحث ہوئی۔ میں نے میر کے متعلق بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا اور مثال میں ایسے اشعار پیش کئے کہ حاضرین محظوظ ہوئے اور اعتراف کیا کہ اُس کی شاعری کے اِن پہلوؤں پر ہماری نظر نہ تھی۔ میرے عزیز دوست جوش ملیح آبادی نے تو یہاں تک غلو کیا کہ عشرۂ محرم کی طرح "عشرۂ میر" منعقد ہونا چاہئے جس میں اثر، میر کے اشعار پڑھیں اور ہم سب اُن کے گرد حلقہ باندھ کر ماتم کریں۔ یہ پر لطف صحبت رات کے ایک یا دو بجے ختم ہوئی جب صبح کو میری آنکھ کھلی تو زبان پر بلا قصد وارادہ یہ شعر جاری ہوا ؎

رات کو ایسی ہوک دل میں اُٹھی　　اک گرہ رہ گئی جہاں دل تھا

خیال ہوا کہ شب کی صحبت میں جو اشعار میر کے پڑھے تھے اُنھیں میں کا ایک ہے۔ غور کیا تو ایسا نہ تھا۔ بنظر احتیاط میر کے دواوین کی ورق گردانی کی۔ شعر کیسا اس زمین میں اُن کی غزل ہی نہیں۔ القا ہوا کہ چونکہ میں نے صدق اور خلوص کے ساتھ میر صاحب کی مدح سرائی کی تھی اور اُن کے کلام کے نکات ولطایف بیان کئے اس کے صلہ میں اُن کی روح پُرفتوح نے یہ شعر مرحمت کیا ہے۔ بعد ازاں غزل پوری کی اور مقطع میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ میرے لئے شعر میں ایک درس بھی ہے۔ میر صاحب کا معرف اور معتقد ہونے کے باوصف میری خود سر طبیعت کہتی تھی کہ جب وزن پورا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو رات، صبح، کل اور اسی قبیل کے بھرتی کے الفاظ خواہ مخواہ ٹھونس دیتے ہیں۔ شعر مندرجہ سے لفظ "رات" نکال دیجئے سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ امید ہے کہ دو دن اُدھر جو خط میں نے روانہ کیا تھا اب آپ کو مل گیا ہو

آپ کا اثر

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۱۴ جنوری ۱۹۵۶ء

پیارے بھائی فاروقی - اب میں سمجھا کہ شاعری میں آفاقیت سے آپ کی مراد کیا ہے۔ بلا مبالغہ میر کے سیکڑوں اشعار پیش کردوں گا فی الحال غالب کا نقل کردہ یہ مطلع لیجئے۔ جو حسنِ اتفاق سے (آپ یقیناً سوءِ اتفاق کہیں گے) میر کے ایک مطلع کا دست نگر ہے ؎

غالب ؎　بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے،　　ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

میر ؎　ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا　　دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

غالب نے شیخ علی حزیں کے ایک مطلع میں ایک ردیف کو بیکار قرار دیا تھا۔ اُن کے مطلع میں خیر سے دونوں ردیفیں بیکار ہیں ؎ "دنیا بازیچۂ اطفال ہے۔ روز و شب تماشا ہوتا ہے" مطلب پورا ہی نہیں ہوگیا بلکہ "مرے آگے" کا ٹکڑا قول کی آفاقیت میں بارج تھا وہ نکل گیا۔ میر کا مطلع اِن تمام اسقام سے پاک ہے۔ غور کرنے کے بعد اپنی رائے سے مطلع کیجئے۔ غالب کا دوسرا شعر ہے ؎

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی　　ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

شعر کی خوبی میں کوئی شک نہیں۔ میر کا مقطع سنئے ؎

جب سے نامہ بر جنوں گردن بندھا ہی تب سے میر　　جیب جاں وابستۂ زنجیرِ تا داماں ہوا

غالب کے شعر کا حاصل یہ ہے کہ کشاکش ہائے ہستی سے آزادی ممکن نہیں - موج ہاتھ پاؤں مارتی ہے تو زنجیر اور زیادہ اُلجھتی ہے اور وہ زنجیر خود موج کی روانی یا سعی ہے - (میرے نزدیک سعیِ آزادی سے جہدِ آزادی کہنا کہیں بہتر ہوتا - سعی محض کوشش ہے اور جہد کوشش بسیار یا تگ و دَو ہے - خیر اِسے جملۂ معترضہ تصور کیجئے) میر کہتا ہے کہ خود جاں وابستۂ زنجیر ہے، لہٰذا ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ نہیں ہو سکتا - بہر حال میں ناموسِ عشق کی نگہداشت لازم ہے آزادی تو اُس وقت تک تھی کہ:

"طائرِ جاں قفسِ تن میں گرفتار نہ تھا" (پورا شعر میر کا یہ ہے ؎

صد گلستاں تہ یک بال تھے اُس کے جب تک طائرِ جاں قفسِ تن میں گرفتار نہ تھا)

آپ کا نقل کردہ تیسرا شعر غالب کا یہ ہے ؎

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اس کی شرح "چھان بین" یا "تنقیدی مضامین" میں کر چکا ہوں - میر کا شعر مقابلہ میں سنئے :-

ہاں جیسے شمع بزم اقامت نہ کر خیال، ہم "دِل کباب" پردے میں سرگرم راہ ہیں

وہی بظاہر اقامت مگر در پردہ طئ منزل جو غالب کے شعر کا خلاصہ ہے - وہی میر کے شعر کا ہے ہاں تکلف اور تصنع کے ساتھ شکوہِ الفاظ ہے - یہاں حقیقت کے دست بدست ندرت ادا ہے آپ غالب کے اشعار لکھتے جائیے، میں جواب میں میر کے اشعار پیش کرتا جاؤنگا فیصلہ کا انحصار آپ ہی پر رہے گا - انشاء اللہ آپ آفاقیت کے معاملہ میں بھی میری طرح میر کے قائل ہو جائیں گے - اس کے بعد میر کے فاضل اشعار جن میں آفاقیت ہے درج کر کے آپ سے استدعا کروں گا کہ ان کے جواب میں غالب کے اشعار ڈھونڈھئے - اقبال اور میر کا کوئی موازنہ نہیں، ایک قومی یا ملی شاعر - ایک غزل گو -

آپ کا اثر

"آفاقیت" کے تصور پر میں نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا اُن کا اعادہ قدرے تفصیل سے اسی مقالہ میں اس موقع پر ہوگا جہاں حضرت اثر کی تنقیدوں پر تبصرہ کیا جائے گا - حضرت اثر نے غالب کے شعر "بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے الخ" کو میر کے ایک شعر "ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا" الخ" کا حسنِ اتفاق سے دستِ نگر بتایا تھا - مگر میں اب بھی یہ کہتا ہوں کہ میر کا مذکورہ شعر غالب کے شعر کے سامنے بالکل تہی نظر آرہا ہے - کیا بلحاظِ حسنِ ادا، کیا باعتبار مطالب اور کیا بہ حیثیت تخئیل و تفکر - شاعر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نظم میں (اور بڑی حد تک یہ بات نثر پر بھی صادق آتی ہے) جس قسم کے خیال کا اظہار یا اعادہ کرنا چاہتا ہے اُسی کی حیثیت و مرتبت اور قدر و قیمت کے معیار و اعتبار سے الفاظ بھی لائے - اگرچہ کسی زبان میں دو مترادف الفاظ مشکل ہی سے مل سکتے ہیں - اُن میں کوئی نہ کوئی لطیف فرق ضرور ہوتا ہے ——— اور وہ فرق وہاں کھلتا ہے جہاں لفظ چاروں چُھل چوکس بیٹھ جائے - اُلفت، محبت، عشق، اُنس اور جنون ان سب الفاظ کو سمجھنے کے لئے ہم ایک جذبے سے تعبیر کرتے ہیں لیکن کسی شعر میں عشق کھپ جاتا ہے کہیں جنوں مزا دے جاتا ہے اور کہیں اُلفت - میر، درد، سودا، غالب، مومن، آتش، ناسخ، مصحفی، انشا (اور اس فہرس میں ہر اُس شاعر کو بڑھا لیجئے جو کسی اسکول کا نمایندہ ہے یا جس کا اپنا طرز و اسلوب ہے) ان شعرا کو اور انکے کلام کو ہم جس معیار سے ممتاز و ممیز کر کے دیکھتے وہ طرز ہے کہ ایک بات کو کس نے کن الفاظ میں کہا؟ جہاں تک میر کے کلام کا تعلق ہے میں نے خود اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "... میر... الفاظ کے مزاج کو پہچانتا ہے، الفاظ سے لہجہ اور لہجہ سے موسیقی پیدا کرتا ہے - الفاظ کے مزاج اور آہنگ سے اشعار میں ندرت اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے ...." (میر کا آرٹ : نیا دور لکھنؤ جلد ۱۰ شمارہ ۱۱) لیکن کم از کم زیر بحث شعر کے موازنہ میں یہ بات ماننی پڑے گی کہ غالب کا شعر حاوی ہے اور میر نے جو کچھ کہا ہے وہ سب کچھ غالب نے "بازیچۂ اطفال" کہکر ادا کر دیا ہے - حضرت اثر یہ فرماتے ہیں کہ میر کے شعر میں حیرت و استعجاب ہے جو غالب

کے شعر سے مستفاد نہیں ہوتا میں نے عرض کیا کہ "بازیچۂ اطفال" صرف اپنی بے وقعتی سے ہی نہیں بلکہ بے سروپائی، بے معنی، وقتی مسرت کون و فساد کی حیرت انگیز عاجلانہ صورت اور اُن تمام صفات و تاثرات کی ترجمانی کرتا ہے جو دُنیا سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔ میر نے کہا ہے کہ دُنیا میں روز نیا تماشا ہوتا ہے، یعنی آج کچھ کل کچھ، ابھی کچھ تو ابھی کچھ! کیا یہ پہلو "بازیچۂ اطفال" میں مضمر نہیں ہے۔؟ میر نے لکھا "دیکھا جو خوب" تو ہے دنیا عجب تماشا! — غالب نے غور سے دیکھنے کا ذکر ہی نہیں کیا، غور سے اُس چیز کو دیکھا جاتا ہے کہ جس کی وقعت اور قیمت ہو۔ غالب کی نظروں نے ہنگامۂ عالم کو جب بازیچۂ اطفال سمجھ لیا تو پھر اُس کا نوٹس ہی نہیں لیا۔! حضرت اثر فرماتے ہیں کہ غالب کی دونوں ردیفیں بیکار اور بھرتی کی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ دونوں بکار آمد ہیں اور شعر کی عظمت کو ردیف ہی بڑھا رہی ہے ورنہ مضمون بقیہ تو ایک طفلِ نو مکتب بھی کہہ سکتا تھا۔ غالب کے پہلے مصرع میں "مرے آگے" بہ معنی "مرے نزدیک" صرف ہوا ہے، اور دوسرے مصرع میں "مرے سامنے" کے معنوں میں — اور ہم اس ردیف کو چھوڑ کر صرف اتنے خیال کو کہ "دُنیا روز و شب تماشا ہے روز و شب تماشا ہوتا ہے" کوئی بلند شاعرانہ خیال تسلیم نہیں کر سکتے۔ برخلاف اس کے اگر میر صاحب اپنے شعر کا صرف پہلا مصرع کہتے اور دوسرا موزوں ہی نہ کرتے تب بھی اُن کا مطلب ادا ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے مضمون "میر کا آرٹ" میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، میر اور غالب کی فنی حیثیت و مرتبت اور نظریات شعری کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا:

"... کچھ ناقدوں نے میر و غالب کا موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ بے سود رہی کیونکہ موازنے کے لئے مطابقت شرط ہے۔ غالب صاحبِ فکر ہیں، میر صاحبِ نظر۔ غالب ایک مفکر ہیں میر مبصر و مشاہد، غالب دماغ سے زیادہ کام لیتے ہیں، میر دل سے۔ میر کا "عشق" جس آگ میں "بے خطر" کود پڑتا ہے وہاں غالب کی عقل محوِ تماشائے لبِ بام نظر آتی ہے ....
غالب اور میر کے بنیادی تصورات میں بھی بہت فرق ہے۔ میر کو تصوف کی عملی تعلیم ملی جس نے اُس کے دل کی کھڑکیوں کو کھولدیا غالب نے فلسفہ اور تصوف کو کتابوں میں تلاش کیا اُن کے ذہن کو بیداری اور روشنی ملی ....."

جہاں تک اُردو شاعری میں آفاقیت کا تعلق ہے وہ پوری طرح کہیں بھی جلوہ گر نہیں ہوئی مگر لاریب کہ میر کی شاعری میں جو محسوسات و مدرکات ہیں وہ آفاقی جذبات اور صداقت و حقیقت سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر بھی اگر فکر و نظر کے معیار سے دیکھا جائے تو غالب، میر سے بہت اونچے نظر آئیں گے۔ غالب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے سب سے پہلے پاپولر سائکالوجی (نفسیات عامہ) کے نکات کو اشعار کی صورت میں نہایت کامیاب انداز سے پیش کیا اور اُن سے پہلے کسی شاعر کے کلام میں یہ وصف اشاذ کالمعدوم کا درجہ رکھتا ہے مثلاً اُن کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
؎ غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
؎ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

یہ چند شعر واردی میں لکھے گئے ہیں اگر اُن کے دیوان کو سامنے رکھ کر ایسے اشعار کا انتخاب کیا جائے تو بڑی معقول تعداد میں نکلیں گے۔

دوسرا شعر حضرت اثر نے میر کا نقل کیا ہے:

جب سے ناموسِ جنوں گردن بندھا ہے تب سے میر — جیب جاں وابستۂ زنجیر تا داماں ہوا

اور اسے بلحاظ مطالب اور باعتبار حسنِ ادا غالب کے شعر پر جزوی ترجیح دی ہے۔ لیکن یہاں بھی فرقِ فکر اور نظر یا احساس اور ادراک کا ہے۔ میر نے جیب جاں کو وابستۂ زنجیر بتایا ہے۔ اس شعر کا پورا رچاؤ صرف اُس کے ذہن و احساس پر تو ہو سکتا ہے جو

وادیِ جنوں سے گزرا ہو ایک عامی کیا وہ عالم بھی جو ان لطیف احساسات سے محروم ہو شعر کا پورا لطف نہیں اُٹھا سکتا۔ لیکن غالب نے ایک بدیہی مثال دی ہے اور اُنھوں نے جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ صرف انسان ہی نہیں، حیوانات، جمادات، نباتات اور اُن تمام اشیا پر صادق آسکتی ہے جن میں فساد کی صلاحیت موجود ہے جو بن کر بگڑ جانے والی ہیں۔ غالب کہتا ہے کہ زندگی کے جھمیلوں اور بکھیڑوں سے آزادی کی کوشش کرنا اور چھٹکارے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا بے سود ہے۔ موجوں کی 'فرصتِ روانی' خود اُن کے لئے زنجیر بن گئی ہیں (جتنا اُلجھتی ہیں اتنا ہی روانی میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ موج کی روانی ہیں اور اضافہ ہوتا ہے) موج آب کی روانی (زنجیر موج کا اُلجھنا اور اُن کی سعی و کوشش بالکل عام مشاہدے اور ادراک سے تعلق رکھتی ہے۔ میر کے فرمودہ کے بالکل برعکس، جو ایک انفرادی احساس ہے۔

حضرت اثر نے فرمایا کہ "سعی" کی جگہ "جہد" کہنا زیادہ موزوں ہوتا کیونکہ اس سے کوشش بسیار کے معنی پیدا ہوتے۔ میں عرض کروں گا کہ جہد کہنے سے شعر بالکل بے جان ہو جاتا۔ جب مطلق کوشش کرنا ہی بے سود ہے تو کوشش بسیار بھی بے کار ہوئی۔ پہلے مصرع میں انداز بیان سے ہی یہ مطلب نکالا گیا ہے کہ زندگی یا وجود کی کشاکش اور حرکت رہائی ہو ہی نہیں سکتی جو کوشش کرے گا وہ بھی اُلٹی پڑ جائے گی! لہٰذا سعی کہنے سے بھی وہی مطلب ادا ہو گیا جو جہد کہنے سے ہوتا۔

حضرت اثر نے غالب کے تیسرے شعر کے مقابلہ میں میر کا جو شعر پیش فرمایا ہے وہ بھی میرے مندرجۂ بالا بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو غالب کے شعر سے لگا نہیں کھاتا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میر کا شعر دل میں چٹکی لیتا ہے اور ندرتِ ادا کے لحاظ سے غالب کے شعر پر حاوی ہے۔

فانی بدایونی کے شعر پر حضرت اثر نے جو اعتراض وارد کیا ہے میں اُس سے بھی متفق نہیں ہوں۔ فانی کے اس شعر کے جو معنی قریب ہیں وہ اتنے صاف ہیں کہ کوئی اغلاق محسوس نہیں ہوتا۔ شعر کا مطلب میری ناقص عقل میں یہ آیا ہے کہ "میرا ہست موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ تو مجھے نہیں بھولا ہے۔ یعنی اگر تو مجھے بھول گیا ہوتا تو میری ہستی بھی نیستی میں بدل گئی ہوتی کیونکہ میرے وجود کے باقی رکھنے کے لئے جن وسایل کی ضرورت ہے اُن کا تو مہیا کرنے والا تو ہی ہے، اگر میں زندہ ہوں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ جینے کے وسایل میسر ہیں، اور جینے کے وسایل میسر ہیں تو گویا میں تجھے یاد ہوں"۔ فانی کا شعر متصوفانہ رنگ میں ہے۔ ناسخ نے مجاز میں خوب کہا ہے، لیکن اس کا فانی کے مذکورہ شعر سے کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

میرے اِن ہی اختلافی خیالات کے بعد حضرت اثر نے ذیل کا مکتوب لکھا:-

کشمیری محلہ لکھنؤ - ۲۰ جنوری ۱۹۵۶ء

پیارے بھائی فاروقی - ۱۸ جنوری کا خط کل شام کو ملا۔ ناسازیٔ مزاج کی خبر سے افسوس ہوا۔ خدا کرے درد سر کی تکلیف دور ہو گئی ہو۔ جانِ برادر میر اور غالب کا موازنہ ہمیں کسی منزل تک پہونچاتا نظر نہیں آتا بلکہ ناگوار صورت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے میر کہتا ہے "دیکھا جو خوب تو ہے دُنیا عجب تماشا" آپ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ جب غور سے دیکھا تو وہ تماشا بھی کچھ عجب تماشا ہے حالانکہ جو کچھ غالب نے "بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے" میں کہا میر نے "دُنیا عجب تماشا" میں کہدیا۔ عجب تماشا میں حیرت ہے، استعجاب ہے، تغیرات کے اہم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ بازیچۂ اطفال کہنے سے دنیا محض بچوں کا بے معنی گھروندا ہو کر رہ گئی۔ مرے آگے کے ٹکڑے نے قایل کے علاوہ ہر شخص کو بلا کسی استثنا کے طفل مکتب بنا دیا جو غالب کے سامنے اپنے طفلانہ کرتب دکھا رہا ہے۔ بحث آفاقیت یا عالمگیر حقایق سے شروع ہوئی تھی مگر رفعت و جزالت و مضمون آفرینی میں گھر گئی۔ آپ میر کی ہلڑ گی کے بھی قایل ہیں مگر اس کے کلام میں مفکر کا دل نہیں جھلکتا۔ کیا آج تک کوئی ایسا صاحب عظمت و بلند مرتبت شاعر ہوا ہے جو مفکر نہ ہو؟ کیا جو شاعر مفکر نہ ہو وہ ایسے شعر کہہ سکتا ہے؟

بہر فردوس ہو آدم کو الم کا ہے کو،
ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں

ہمت اپنی ہی تھی یہ میر کہ جوں مرغِ خیال
دل نے ہم کو مثالِ آئینہ

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

پتے کو اس چمن کے نہیں دیکھتے ہیں گرم
جو محرمِ روش ہیں کچھ اس بدگماں کے لوگ

ہر قطعہ پر چمن کے ٹک غور سے نظر کر
بگڑیں ہزار شکلیں، تب پھول یہ بنائے

ہستی ہے اپنے طور پر جوں بحرِ جوش میں
گرداب کیسا، موج کہاں ہے، حباب کیا؟
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یہ منزلِ خراب ہوئی ہے کبھو کی طرح

ہم جانتے تھے تازہ بنائے جہاں کو لیک
یا عالم آئینہ ہے اُس یار خود نما کا

یہ دو ہی صورتیں ہیں یا منعکس ہے عالم
آئینہ تھا، تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
طائرِ جاں قفسِ تن میں گرفتار نہ تھا

صد گلستاں تہ یک بال تھے اسکے جب تک
فقط مزا ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہے

غمِ فراق ہے دنبالہ گردِ عیشِ وصال
کس کا ہے رازِ بحر میں یارب کہ ہے یہ جوش

ہر جزر و مد سے دست و بغل اُٹھتے ہیں خروش
اتنے ظہور پر بھی جو منہ کو چھپا رہے ہے

اُس آفتابِ حُسن کے ہم داغِ شرم ہیں
دگر نہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

سراپا آرزو ہونے بندہ کر دیا ہم کو
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

= تو ہم کا کارخانہ ہے
آئینہ ہو کے صورتِ معنی سے ہے لبالب
رازِ نہانِ حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

مری نمود نے مجھ کو کیا برابرِ خاک
میں نقشِ پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

اگرچہ نشّہ ہوں سب، میں خمِ جہاں میں میر
برنگِ مے عرقِ انفعال اپنا ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

وہم جس کو محیط سمجھا ہے
دیکھئے تو سراب ہے وہ بھی

اور نہ معلوم کیا کیا۔ روا روی میں جو اشعار یاد آئے درج کر دئے۔ کلام غالب کی طرح کلام میر کا بالاستیعاب مطالعہ کیجئے۔ پھر کوئی رائے قایم کیجئے۔

مصحفی کا ایک قلمی دیوان میرے پاس ہے اور جہاں تک علم ہے غیر مطبوعہ ہے۔ آپ کے ملاحظہ کے لئے لیتا آؤں گا۔ رسالہ تحریک دہلی میں کچھ دن ہوئے ایک مضمون بھیج چکا ہوں۔ عجب اتفاق ہے کہ اُس میں مصحفی کے بھی بعض اشعار پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ شایع ہو تو پڑھئے۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

(باقی)

آپ کا اثر

قدیم تذکرے

پہلے شاعر پیدا ہوا اس کے بعد مشاعرے وجود میں آئے اور پھر اہلِ مشاعرہ نے بیاضوں میں اپنی اپنی پسند کے اشعار لکھنا شروع کئے بعض لکھنے والوں نے منتخب اشعار کے ساتھ ساتھ شاعر کا نام بھی لکھ دیا اس کے کچھ حالات بھی درج کر دئے اور اس طرح تذکرہ نگاری کی ابتدا ہوئی۔

یہ بیاض نویسی کب شروع ہوئی اس کی کوئی تاریخ متعین نہیں کی جا سکتی اور نہ یہ پتہ چل سکتا ہے کہ اس وقت تک کتنی بیاضیں لکھی گئیں۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ ان بیاضوں میں شاعر کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا تھا اس کی زبان فارسی ہوتی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اُردو شاعری کے رواج کے بعد بھی تصنیف و تالیف کی زبان عرصہ تک فارسی ہی رہی اور دوسرا یہ کہ فارسی شعرا کے تذکرے پہلے سے موجود تھے اور ان کو سامنے رکھ کر اُردو شعراء کا تذکرہ لکھنا زیادہ آسان تھا۔

اُردو شاعری کی ابتدا یوں تو جہانگیر کے ہی عہد میں ہو چکی تھی اور شاہجہاں کے زمانہ میں وہ ابتدائی دور سے گزر کر زبان و اسلوب بیان دونوں حیثیتوں سے اپنی جگہ الگ پیدا کر چکی تھی لیکن اس وقت کے شعراء قریب قریب سرزمین دکن سے تعلق رکھتے تھے۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں بھی زیادہ تر دکنی شاعروں کے نام سامنے آتے ہیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں ولی دکنی کا نام ہے اور جسے اُردو شاعری کا ابوالآثار سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں اکبرآباد اور شاہجہاں آباد دونوں جگہ فارسی شاعری ہی کا رواج تھا۔ اس کے بعد جب ۱۱۳۲ھ میں بہ عہد محمد شاہ ولی کا دیوان دہلی پہونچا تو لوگوں کو اُردو شاعری کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب اُردو شاعری عبارت تھی صرف دکنی شاعری سے۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ اس زمانہ میں دکن نے شاعر تو بہت پیدا کئے لیکن تذکرہ نویس کوئی پیدا نہ کیا۔ صرف دو تذکرے شعراء دکن کے مرتب کئے گئے۔ لیکن وہ بھی اس وقت جب دہلی میں شاعری کے ساتھ ساتھ تذکرہ نویسی کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا ہے یہ تو بالکل یقینی ہے کہ اُردو شاعروں کے تذکرے فارسی میں لکھنا شروع کئے گئے لیکن سب سے پہلا تذکرہ کب اور کس نے لکھا اس کا صحیح علم ہم کو حاصل نہیں لیکن میر کے بیان کو صحیح باور کیا جائے تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ میر کے نکات الشعراء سے پہلے شعراء اُردو کے حالات میں کوئی کتاب تحریر میں نہیں آئی۔ بالکل یہی بات قایم چاند پوری نے بھی اپنے تذکرہ مخزن نکات کے متعلق لکھی ہے۔ لیکن قایم کا بیان صحیح نہیں کیونکہ اس کا تذکرہ ۱۱۶۸ھ میں لکھا گیا جب کہ میر کا تذکرہ نکات الشعراء اس سے تین سال قبل ۱۱۶۵ھ میں مرتب ہو چکا تھا ہاں میر کا بیان البتہ غور طلب ہے۔

دتاسی کا خیال ہے کہ میر کے تذکرہ سے پہلے کئی تذکرے موجود تھے اور اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ محمد شاہ اور احمد شاہ کے عہد کے چند تذکروں کا ذکر کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً تذکرہ سید امام الدین جو عہد محمد شاہ میں لکھا گیا دوسرا تذکرہ خان آرزو کا اور تیسرا سودا کا لیکن چونکہ یہ تذکرے ناپید ہیں اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ میر کی نگاہ سے گزرے ہوں لیکن اس کا ذکر انھوں نے نہیں کیا۔ افضل بیگ اور نگ آبادی کے تحفۃ الشعراء اور خواجہ حمید اورنگ آبادی کے تذکرہ گلشنِ گفتار کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ یہ میر کے نکات الشعراء سے قبل لکھے گئے تھے لیکن اول تو یہ تذکرے بہت ناقص ہیں اور ان میں صرف شعراء دکن کا ذکر کیا گیا ہے دوسرے یہ کہ ان کا سن تحریر

بھی وہی ۱۱۶۵ھ ہے جو میر کے نکات الشعراء کا ہے۔ بہر حال اس وقت جتنے تذکرے موجود ہیں ان میں میر کے نکات الشعراء ہی کو سب سے پہلا قابل تذکرہ قرار دیا جا سکتا ہے جس کی تقلید میں بعد کو متعدد تذکرے لکھے گئے اور جن میں اکثر کا ماخذ میر کا نکات الشعراء ہی ہے۔

میر کے بعد سب سے پہلے فتح علی حسینی گردیزی نے ۱۱۶۶ھ میں تذکرہ ریختہ گویان لکھا اس کے بعد ۱۱۶۸ھ میں قایم چاندپوری نے مخزن نکات کے نام سے ایک تذکرہ تحریر کیا۔ اس کے چھ سال بعد ۱۱۷۵ھ میں شفیق اورنگ آبادی نے چمنستان شعراء کے نام سے ایک تذکرہ تصنیف کیا اس کے بعد میر حسن نے ایک تذکرہ لکھا اور سید غلام حسین نے ۱۱۹۳ھ میں تذکرہ شورش تحریر کیا۔

اس کے بعد پھر عرصہ تک سناٹا رہا اور ۱۲۰۹ھ میں مصحفی نے اپنا پہلا تذکرہ لکھا اور ۱۲۲۱ھ میں دوسرا تذکرہ ریاض الفصحا کے نام سے مشہور ہے۔ قدرت اللہ قادری کا مجموعۂ نغز بھی اسی زمانہ کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ خوب چند ذکا نے بھی ایک کتاب عیار الشعراء کے نام سے لکھی۔ یہ تذکرہ تفصیل و جامعیت کے لحاظ سے اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ تھا جو تیس سال میں جا کر تمام ہوا یہ ۱۵۰ شعراء کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد میر محمد خاں سرور نے خوب چند کے تذکرہ کو سامنے رکھ کر عمدہ منتخب کے نام سے ایک تذکرہ لکھا لیکن اس عہد کے تمام تذکروں میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا گلشن بیخار جو ۱۲۵۰ھ میں شایع ہوا تھا ——— خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے اس تذکرے کے جواب میں قطب الدین باطن نے گلستانِ بے خزاں لکھا اور اس میں شیفتہ کے بعض بیانات کی تردید کی۔

یہ تھی قدیم تذکروں کی فہرست جو میر کے نکات الشعراء سے متاثر ہو کر لکھے گئے لیکن یہ تاثرات دو طرح کے تھے ایک وہ جو میر کے موافق تھے اور دوسرے وہ جو میر کے مخالف تھے۔

مخالفین میں میر کا سب سے پہلا حریف گردیزی تھا جس نے نکات الشعراء کے جواب میں تذکرہ ریختہ گویان لکھا اور میر کی بعض رایوں کو بے جا نکتہ چینی قرار دے کر ان کی تردید کی۔

گردیزی کے علاوہ میر محمد خاکسار، حکیم قدرت اللہ، قاسم شفیق اورنگ آبادی، مولوی کریم الدین اور اخیر میں محمد حسین آزاد نے اپنے تذکروں سے میر کو نشانۂ ملامت بنایا۔ اس میں شک نہیں کہ میر کے تذکرہ میں جا بجا نہایت نامناسب تلخ لہجہ اختیار کیا گیا ہے اور اظہار رائے میں بھی بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ تذکرہ نویسی میں اولیت کا فخر میر ہی کو حاصل ہے اور جچے تلے الفاظ میں انھوں نے شاعر کی شخصیت یا اس کی شاعری پر رائے دی ہے ان کی مثال ہم کو دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔

ان تذکروں کے علاوہ جو قصداً میر کے جواب میں ان پر لعن طعن کرنے کے لئے لکھے گئے تھے اور بھی متعدد تذکرے تحریر میں آئے جو نقص سے خالی تھے۔ ان میں قایم، میر حسن، مصحفی، خوب چند ذکا اور شیفتہ کے تذکرے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ قایم کا تذکرہ بالکل نکات الشعراء کا چربہ ہے، لیکن انھوں نے شعراء دکن کے حالات فراہم کرنے میں بھی خاص اہتمام سے کام لیا ہے۔ میر حسن کے تذکرہ کا ماخذ قایم ہی کا تذکرہ ہے لیکن انھوں نے انتخابِ کلام بہت اچھا کیا ہے اور رائے دینے میں بھی بڑی میانہ روی اور اعتدال سے کام لیا ہے۔

مصحفی کے تذکرہ میں اس کے سوا کوئی نئی بات نہیں کہ انتخاب اشعار زیادہ ہے۔ حالات حاظرہ تفصیل کے ساتھ دئے گئے ہیں اور اظہار رائے کے لئے بھی بہت مناسب الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

جن تذکروں کا ذکر ابھی کیا گیا ہے یہ پہلے دور سے متعلق تھے۔ ان کے بعد دوسرا دور شروع ہوا جب انگریزوں کی آمد کے بعد مغربی علوم کے رواج سے ادب میں جدید رجحانات پیدا ہوئے اور تذکرہ نگاری پر بھی اس کا یہ اثر پڑا کہ تذکروں کی ترتیب میں واقعات کی تاریخی تعین کی طرف توجہ زیادہ ہوگئی لسانی تحقیق کو بھی پیش نظر رکھا گیا۔ مختلف اصناف سخن کی ترقی کے اسباب پر بھی بحث ہونے لگی اور اس طرح رفتہ رفتہ تذکروں نے ادبی تاریخ کی حیثیت بھی اختیار کر لی۔ اس دور کے تذکروں میں گلزار ابراہیم اور گلشن ہند کے علاوہ دتاسی، کریم الدین اور عتبائی کے تذکرے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ گلزار ابراہیم کے مصنف کا نام ابراہیم خاں تھا

یہ پٹنہ کے رہنے والے تھے اور لارڈ کارنوالس کے زمانہ میں بنارس کے چیف مجسٹریٹ تھے انھوں نے تذکرہ لکھنے میں بڑے اہتمام سے کام لیا۔ شعراء کے تفصیلی حالات ان کے زمانہ کی تعین تاریخ وفات کی تحقیق، خطوط کے اقتباسات وغیرہ دے کر اپنے تذکرہ کو سوانحی رنگ دے دیا جو اس سے پہلے بالکل نہ پایا جاتا تھا۔ انھوں نے فارسی شعراء کے بھی دو تذکرے صحف ابراہیم اور خلاصۃ الکلام کے نام سے مرتب کئے گلشنِ ہند اسی تذکرہ کا ترجمہ ہے اور بقول دتاسی پہلا تذکرہ ہے جو اُردو میں لکھا گیا ورنہ اس سے قبل تمام تذکروں کی زبان فارسی تھی یہ ترجمہ علی لطف نے گلکرائسٹ کی فرمائش پر کیا۔ اور فورٹ ولیم کالج کے ادبی آثار سے تعلق رکھتا ہے۔

تذکرہ نگاری کے اسی دور میں دہلی نے بعض بہت اچھے تذکرہ نویس پیدا کئے جن میں امام بخش صہبائی کا نام بہت نمایاں نظر آتا ہے یہ دہلی کالج میں فارسی کے استاد تھے اور فارسی زبان کے بڑے مستند فاضل سمجھے جاتے تھے انھوں نے ۱۲۶۰ھ میں ولی، سودا، میر، جرأت، حسن، نصیر، ممنون، ناسخ، مول چند، ذوق اور مومن کے کلام کا انتخاب شایع کیا جس کا نام "خلاصہ دواوین شعراء مشہور زبان اُردو" تھا۔ انھوں نے صرف کلام کا انتخاب نہیں کیا بلکہ ہر شاعر کے حالات بھی درج کئے اور ابتدا میں ایک مقدمہ بھی شامل کیا جس میں اُردو شاعری پر انتقادی نظر ڈالی گئی تھی۔

اسی زمانہ میں ایک تذکرہ گلستانِ سخن کے نام سے شایع ہوا جو صہبائی اور قادر بخش صابر کی متحدہ کوشش کا نتیجہ بتایا جاتا ہے۔ اس تذکرہ کا نام "آثار المعاصرین" ہے اور گلستانِ سخن اس کا تاریخی نام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۷۱ھ میں لکھا گیا تھا۔

اس میں زیادہ تر شعراء دہلی ہی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ابتدا میں ایک مقدمہ کے ذریعہ سے اُردو زبان کی تحقیقی اور اُردو شاعری کی تدریجی ترقی پر گفتگو کی گئی ہے۔

اس دور کا اہم ترین تذکرہ گارسن دتاسی کی تصنیف ہے جسے ادبی تاریخ اور معجم الشعرا کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ تذکرہ تین جلدوں میں صہبائی کے تذکرہ سے پانچ سال قبل ۱۸۳۹ء میں شایع ہوا تھا۔ چونکہ دتاسی کا مقصود شاعروں کی ایک مکمل فہرست مرتب کرنا تھا اسلئے اس کی کتاب میں اُردو ہندی کے تین ہزار شاعروں کے نام نظر آتے ہیں۔ ہر چند ان میں اکثر ایسے شعراء کا بھی نام نظر آتا ہے جو ذکر کے قابل نہ تھے تاہم اس کا یہ کارنامہ بڑا قابلِ قدر ہے۔ اس کتاب کا بہترین حصہ اس کا مقدمہ ہے جس میں اس نے اُردو زبان کی تحقیق اور اُردو ہندی شاعری کے اقسام پر مفصل بحث کی ہے اور بہ حیثیت مجموعی اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے۔ جس میں ادبی تاریخ، تذکرۃ الشعراء کا انتخاب کلام اور تبصرہ کے علاوہ ان تذکروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس سے قبل شایع ہو چکے تھے۔ یا اس کی نگاہ سے گزر چکے تھے اور جن کی تعداد اسنے ۱۱۳ ظاہر کی ہے گویا یہ بیک وقت شعراء کا بھی تذکرہ ہے اور تذکروں کا تذکرہ بھی۔

اس کی اشاعت کے نو سال بعد اس کی بنیاد پر مولوی کریم الدین نے فیلن کی مدد سے ایک تذکرہ "طبقات الشعراء" کے نام سے لکھا اسکی نوعیت دتاسی سے مختلف ہے۔ دتاسی کا تذکرہ تو ایک معجم یا ڈکشنری کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن کریم الدین کا تذکرہ ایک تاریخی تصنیف ہے جس میں مختلف ادوار و طبقات قایم کرکے سنہ وار شعراء کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ایک بسیط مقدمہ لکھکر اُردو اور ریختہ کی ابتدا اس کی تدریجی ترقی، ہندی اُردو شاعری کی خصوصیات پر اتنی تفصیلی بحث کی ہے کہ اُردو زبان اور اُردو شاعری کی تاریخ کہا جائے تو مناسب نہ ہوگا۔

دتاسی اور کریم الدین کے ان تذکروں کے بعد تذکرہ نگاری کا رنگ بہت بدل گیا اور بعد کے مصنفین نے اسی رنگ میں لکھنا شروع کیا۔ چنانچہ نسخہ دلکشا اور عبدالحئی صفا بدایونی کا شمیم سخن بالکل طبقات الشعراء کا چربہ ہے اس کے بعد درگا پرشاد دہلوی ۱۸۷۱ء میں خزینۃ العلوم کے نام سے جو تذکرہ شعراء دکن کا لکھا وہ بھی اس انداز کا نیم تاریخی تذکرہ ہے۔ اس نے ایک تذکرہ شاعر عورتوں کا بھی گلشن ناز کے نام سے لکھا جو اپنے مخصوص موضوع کے لحاظ سے بالکل پہلا تذکرہ تھا لیکن اس کے بعد فصیح الدین میرٹھی نے شاعر عورتوں کا جو تذکرہ بہارستانِ ناز کے نام سے لکھا وہ زیادہ مکمل چیز ہے۔

سلسلۂ بیان میں اب ہم آزاد کی آبِ حیات تک پہونچ گئے ہیں جو دوسرے دور کی آخری اور تیسرے دور کی پہلی کڑی ہے جب کہ

یہ کتاب ۱۸۸۰ء میں شایع ہوئی تو لوگ دفعتاً چونک پڑے کیونکہ اس انداز کا تذکرہ اس سے پہلے کسی نے نہ لکھا تھا۔ اس کی عبارت کی دلکشی اس کے چھوٹے چھوٹے رنگین فقرے۔ لطایف و ظرائف اور افسانوی انداز بیان ان سب باتوں نے مل کر اسے بہت دلچسپ بنا دیا تھا آزاد نے شعراء کے ادوار و طبقات متعین کئے۔ اُردو زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالی۔ برج بھاشا پر فارسی کے اثرات سے بحث کی۔ ہندوستان کی قدیم زبان کا جائزہ اور شاعروں کے حالات لکھنے میں ان واقعات پر زیادہ توجہ صرف کی جس سے ان کے کردار پر روشنی پڑتی ہے لیکن جس حد تک تحقیق واقعات اور شاعری پر رائے زنی کا تعلق ہے آبِ حیات کوئی ایسی مستند کتاب نہیں جس کے بیانات کو آنکھ بند کرکے تسلیم کر لیا جائے۔

رعایتی اعلان

من و یزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — جالستان — نگارستان — شہوانیات — مکتوبات نیاز تین حصے
مغہ عہ ۱۲ عہ ۱۲ عہ ۱۲

انتقادیات — مالہ و ماعلیہ — حسن کی عیاریاں — شہاب کی سرگزشت — فلاسفۂ قدیم — مذاکرات نیاز — فراست الید — نقاب اُٹھ جانے کے بعد
عہ ۱۲ عہ ۱۲ عہ ۱۲ عہ ۱۲ عہ ۱۲ عہ ۸

میزان
عہ ۵۲

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپیہ میں مل سکتی ہیں۔ منیجر نگار لکھنؤ

"نگار" کے پچھلے فایل

۳۲ء	= جولائی تا دسمبر	= ———	= عہ ۱۰
۳۶ء	= جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ ہندی شاعری)	= عہ ۲۰
۳۸ء	= جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ اصحاب کہف و خلافت نمبر)	= عہ ۲۰
۳۹ء	= جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ مصحفی نمبر)	= عہ ۲۰
۴۰ء	= جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ نظیر نمبر)	= عہ ۲۰
۴۴ء	= جولائی تا دسمبر	= ———	= عہ ۱۰
۴۶ء	= جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ انتقاد نمبر)	= عہ ۲۰
۴۷ء	= جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ ماجد و لین نمبر)	= عہ ۲۰
۴۹ء	= جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ افسانہ نمبر)	= عہ ۲۰
۵۰ء	= جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ تنقید نمبر)	= عہ ۲۰
۵۲ء	= جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ حسرت نمبر)	= عہ ۲۰
۵۳ء	= جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ داغ نمبر)	= عہ ۲۰

نوٹ: صرف ایک ایک فایل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہونچے گا اُسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصول ڈاک کے علاوہ۔ منیجر نگار لکھنؤ

عرش کی شاعری

(عبدالحئی خاں سیوراوی)

عرش ملسیانی کی پیشِ نظر شاعری کا عرصہ پچیس برس کا ہے جو ہندوستان کی سیاسی کشمکش کا دور ہے ابھی ۱۹۲۱ء کی دردناک آہیں سنی جارہی تھیں کہ ۱۹۳۸ء کے انعام واکرام کی بارش میں ۱۹۴۲ء کی بجلیاں تڑپنے لگیں۔ مسلم لیگ منظم ہوگئی۔ فرقہ واری سیاست نے ہندوستانی قومی کانگرس کے کس بل نکال دئے اور اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ ہندوستانی ثقافت وطن پرستی اور جغرافیائی حدود کی تنگنائے سے نکل عالمگیر اور بین الاقوامی قدروں سے آشنا ہونے لگی اور پھر ۱۹۴۷ء کی صبح تک پہونچتے پہونچتے فرقہ واریت، صوبائیت اور اشتراکیت کی کتنی ہولناک راتوں سے گزرنا پڑا۔ ہندوستان آزاد ہوا لیکن وطن کی مردہ لاش پر کھڑے ہوکر مذہب اور دھرم کے دیوانوں نے خون کی ہولی کھیلی۔ رشوت، چور بازاری اور اقربا پروری سے وطن دوستوں کی تجوریاں بھرنے لگیں۔ غریب اور فاقہ کش عوام نے یہ محسوس بھی نہ کیا کہ ہندوستان آزاد ہوگیا اور اُن کے معاشی نظام میں کسی تبدیلی کا امکان ہے۔ بالآخر جمہوریت آئی اور معاشی اور ثقافتی اقدار میں کسی قدر تبدیلیاں ہوئیں اور غیر مذہبی جمہوری حکومت کی آرزوؤں کے گہوارے میں قومی تعمیر، معاشی تدبیر اور علمی وادبی سرپرستی کے منصوبے جھولنے لگے۔

عرش ہندوستان کے اسی عہد کے نمایندہ ہیں اُن کی شاعری قومی اور ملکی احساسات کی ترجمان ہے اور انسان دوستی کی آئینہ دار۔ وہ قوم پرست، وطن پرست، اشتراکی اور انسان سبھی کچھ ہیں اور اپنی طرزِ شاعری کی بنا پر اقبال اور جوش کا مجموعہ ہیں۔ اُن کے کلام سے سرسری طور پر یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نہ تو وہ کسی نظامِ فکر کے بانی ہیں اور نہ اُن کا تعلق کسی پیغمبر کی امت سے ہے۔ وہ صرف انسان ہیں۔ ہندوستانی ثقافت وتہذیب کے امین اور انسانیت کے داعی۔ زندگی کی جدلیاتی قدروں کا بھی احساس ہے اور عدم تشدد کا گیان دھیان بھی کرتے ہیں۔ زندگی کے مختلف مسایل پر اظہار رائے کرتے ہیں اور اپنے پاکیزہ تغزل، شستہ زبان اور مشق کی بنا پر اس عہد کے شعرا میں ممتاز ہیں۔

کوئی آٹھ برس ہوئے واحد علی ہاشمی صاحب مہتمم واحد لائبریری گورکھپور سے اُن کی تعریف سنی۔ اخبارات ورسایل سے اُنکے کلام کو چننا شروع کیا۔ اور پھر حسنِ اتفاق سے ایک دوست نے اُن کا مجموعۂ کلام "ہفت رنگ" بھی پیش کیا۔ اس طرح اُن کے پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہوگئی۔ "ہفت رنگ" میں اُن کی تصویر دیکھ کر ناسخ لکھنوی کا تصور پیدا ہوا۔ دیباچے میں جناب جوش ملیح آبادی اور پنڈت کیفی آنجہانی کی تحریریں دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ ان دونوں حضرات نے یا تو "رسمِ نقاب کشائی" کی مختصر ترین رسم ادا کی ہے یا عرش کے والد جناب جوش ملسیانی کا نام لے کر اُن کا "نسب نامہ" طیار کیا ہے۔ مجھے اس خیال سے ہمیشہ بے اطمینانی رہی ہے کہ کسی شاعر کا تعارف اُس کے باپ دادوں کی شعری صلاحیتوں کی بنیاد پر کیوں کیا جاتا ہے۔ شاعری بڑھئی اور لوہار کی صنعت نہیں کہ باپ کی شہ پاکر کسبِ معاش کا ذریعہ بن جائے۔ یہ تو کوئی اور شے ہے جو اپنے مقدر سے نصیب ہوتا ہے اگر یہ نہ ہوتا تو ہر عالی نظر شاعر کے شاعر بیٹوں کا ایک طویل سلسلہ ہوتا۔ بہرحال یہ جملہ معترضہ ہے۔ عرش ملسیانی نے ہفت رنگ کے "درمدحِ خود گویم" کے باب میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث کو ہی لایعنی قرار دیا ہے اُن کا خیال ہے کہ

اظہارِ مطالب میں شاعر لاکھ مختار و آزاد سہی لیکن ماحول و وراثت سے متاثر ہونا اس کے لئے ضروری ہے اور اسی لئے اُن کا نظریہ ہے کہ زندگی کے مسایل سے کسی ادب یا ادیب کو مفر ہی نہیں۔ عرش زبان و بیان کی تمام پابندیوں کے بقول جوش استقلال اور اصرار کے ساتھ قایل ہیں۔ اپنے کو عظمتِ اولادِ آدم اور انسان کی عام محبت کا نقیب بتایا ہے اور یہ سب کچھ اس اظہارِ حال کے ساتھ کہ :۔ "مجھے شہرت کے دروازے پر دریوزہ گری کے ڈھنگ سیکھنے کی کوشش کے باوجود نہیں آئے۔ اپنی تعریف پر دوسروں کو آمادہ کرنا تو کجا کبھی ایسے الفاظ سن کر بھی مسرت حاصل نہ کی"۔

اس بیان پر ارباب نظر کو غصہ بھی آئے گا، افسوس بھی ہوگا اور غالباً بعض کو عبرت حاصل ہو۔ لیکن عرش کی یہ خاکساری اُن کی روحانیت اور روایت پسندی کی بنا پر ہے۔ وہ جس ماحول کے پروردہ ہیں اُس میں ایک تہذیب مٹ چکی ہے مگر اُسکے نشانات باقی ہیں۔ روایتی اور فرسودہ ذہنیت پر ضربِ آخر پڑ چکی ہے۔ نئے رجحانات اور میلانات تیزی سے پیدا ہو رہے ہیں قدامت پرستی تو بڑی چیز ہے قدامت پسندی کو سر اُٹھانے میں شرم محسوس ہوتی ہے، مگر عرش کھل کر نہیں کہتے کہ وہ کیا ہیں؟ اِس طرف یا اُس طرف؟ اُن کے اس جھجک اور شرم میں اُن کے دل کے چور سے کہیں زیادہ اُن کا وہ اخلاص بھی شامل ہے جس کا تعلق روایت اور خدا سے بھی ہے اور بدلے ہوئے انسانوں کی زندگی سے بھی۔ مگر وہ بدل رہے ہیں۔ دھیرے دھیرے، ہندوستان کے بہتیرے دانشمندوں کی طرح۔ وہ ایک جست میں اتنے بڑے فاصلہ کو طے بھی نہیں کر سکتے۔ وہ ترقی پسند نہیں کہلاتے لیکن اُن کے یہاں ترقی پسندی اور اشتراکیت دونوں کی پذیرائی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے ادب و شعر کے متعلق اُن کے خیالات نئے ہیں اُن کے یہاں زندگی کے آثار ہیں۔ امن اور اخوت کا پیغام ہے۔ لیکن وہ کسی خاص طبقہ یا گروہ سے متعلق نہیں، اگلی ترقی پسندی نیک خصلت ہو کر بھی نیک نام نہیں۔ اُن کی طبیعت حضرتِ نیازؔ کی طرح ہے جو قدامت سے اجتہاد ثواب، نئی اور توانا قدروں کا احترام لازم اور اشتراکیت پر مکمل ایمان لانا گناہ سمجھتے ہیں۔ عرش نئی پود کے شعرا کے لئے سہارا بھی ہیں خطرہ بھی۔ خطرہ اُن کی روائتیں ہیں۔ اِن سب کے باوجود وہ انسان دوست ہیں اور اُن کی انسان دوستی اور امن پسندی، توڑ پھوڑ، تشدد بیکار اور لوٹ مار سے مبرّا ہے۔ اُن کا یہ مقام اُن کی تدریجی ترقی کا نتیجہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایسے لوگ جو روایتوں سے دھیرے دھیرے اپنی صلاحیتوں کو آزما کر آگے بڑھتے ہیں بڑے ہی دیانتدار اور مخلص ہوتے ہیں۔ عرش کی شاعری پر اُن کے اچھے یا بُرے خیالات کا بھرپور عکس ہے اور یہی وہ شے ہے جو فن کار اور فوٹو گرافر کے فرق کو واضح کرتی ہے۔

عرش کے مجموعۂ کلام کو اول تا آخر پڑھ جایئے اُن کے یہاں تغزل ہر مقام پر نمایاں ملے گا۔ غزل جسے مجنوں کے خیال کے مطابق ہمہ گیری اور وسعت کے آداب سیکھنا چاہئے، عرش کے یہاں بطور تجربہ ملے گی۔ انھوں نے اس کامیاب تغزل کا استفادہ غالباً اقبال سے کیا ہوگا۔ اس خیال کی تصدیق حسب ذیل چند اشعار سے ہو سکتی ہے:۔

چل دہر میں اے مردِ خود آگاہ سنبھل کر — سو جُرم کا اک جُرم ہے ناکردہ گناہی
دل جس کا پُر انوار ہے انوارِ خودی سے — ہے اُس کے لئے ہیچ مقدر کی نگاہی
سنتے ہیں غلاموں کا خدا جاگ اُٹھا ہے — ہے لرزہ بر اندام ہر اک مسندِ شاہی
خونِ مزدور ہے ارزاں ابھی پانی کی طرح — بہرِ سرمایہ ہے یہ مفت کی سوغات ابھی
چمن کے حق میں خرابی ہے ہستیِ گلچیں، — کبوتروں کے لئے موت پنجۂ شاہیں

ان اشعار کے الفاظ اور تیور اقبال کا ہی پتہ دیتے ہیں۔ لیکن اقبال اور عرش کے خیالات میں نمایاں فرق ہے۔ اقبال عالمگیر اسلامی اخوت کے نقیب تھے۔ اُن کے یہاں سب سے بڑی "چنگیزی" یہ تھی کہ وہ مسلمان تھے۔ وہ "شیرانِ غاب" بھی تھے اور "رعنا غزالِ تاتاری" بھی۔ لیکن عرش کے یہاں انسانی اخوت، عدم تشدد اور امن ہی امن کی گرم بازاری ہے۔

عرش کے یہاں اقبال کے مخصوص الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ عرش کا "انوارِ خودی" کے مقابلہ میں "مقدر کی کم نگاہی" کو "ہیچ" کہنا اقبال ہی کی جدت ہے اور خودی اور تقدیر کے مسئلہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی باریک نگاہی پر، اقلیدس کی حقیقتوں کی طرح عرش کی خوش نظری ٹھیک ٹھیک منطبق ہوگئی ہے۔

عرش کی نظم "بازمانہ مساز" خوب ہے لیکن یہاں بھی اقبال کے پیرہن کی خوشبو آتی ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل بند ملاحظہ ہو۔

کوئی مفسرِ حاضر تجھے بتا بھی سکا، زمانہ کہتا ہے تہذیب جس کو ہے کیا شے
یہ وقت ہے کہ زمانہ پہ آشکار کریں وہ رازِ خاص کہ حامل ہیں جسکے یہ رگ و پے
اماں پذیر نہ ماہی شدہ، نہ کامِ نہنگ
سکوں نہ یافت جہاں از فساد و فتنہ و جنگ

عرش کی شاعری کی قوسِ قزح میں وطنیت اور قومیت کا رنگ تمام رنگوں پر غالب ہے۔ اربابِ نظر اسے طبعِ شاعر کی روانی کہیں یا امتدادِ زمانہ کا تقاضا کہ ۱۹۴۰ء کے بعد کی نظموں میں یہ دبا دبا احساس شدید ہوگیا ہے۔ اور ۱۹۴۲ء کے بعد کی نظموں کا جوش و ولولہ دراصل اُس ناعاقبت اندیش سیاست کی تصویر ہے جس کے ماتھے پر خود پسینہ آگیا۔ غزلیں بھی ان جذبات سے بے نیاز نہیں۔ ۱۹۴۰ء کی نظم "انقلاب" کے چند اشعار سنئے:۔

آستانِ دیو استبداد پر جھک نہیں سکتی جبینِ انقلاب
ہے شہیدانِ وطن کی یاد میں خون سے تر آستینِ انقلاب
ہے غلاموں کا خدا عزمِ بلند دینِ مظلوموں کا دینِ انقلاب

پھر ۱۹۴۲ء کی نظم "اشرف المخلوق" کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

یہ حرب کے آلات یہ سامانِ فنا کے یہ فتنے قیامت کے یہ طوفان بلا کے
بڑھتی ہوئی چڑھتی ہوئی یلغار تو دیکھو فتنے کی ذرا گرمیِ بازار تو دیکھو،،
اے اہلِ وطن اپنے وطن کے ہوا میں تم خاتم ہے اگر اس کی محبت تو نگیں تم
اُٹھو کہ اب ایسے میں تو سونا نہیں اچھا طوفان میں یوں جی کا ڈبونا نہیں اچھا

ممکن ہے اس "بڑھتی ہوئی چڑھتی ہوئی یلغار" میں جوش ملیح آبادی کے انقلابی نعروں کی فضا محسوس ہو۔ عرش نے اقبال سے استفادہ کیا ہے اور جوش سے بھی۔ اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ جوش نے ہماری شاعری کو کم از کم انقلابی تکنیک عطا کی ہے۔ جس طرح اقبال نے "فکر و نظر" کا انقلاب دیا تھا۔ غرض اقبال، جوش، اور دوسرے درجے کے بہتیرے رن باندھنے والے شعراء کی گرمی سے عرش نے اپنا کندن رنگ خوب چمکایا ہے۔ یہ خلاف موقع نہ ہوگا کہ اُن کی نظم "تیور دیکھ زمانے کے" چند اشعار پیش کئے جائیں:۔

زہریلے ڈنک چلاتے ہیں دُنیا پر دُنیا والے
گوری قوموں کی چاندی ہے معتوب مقدر کالے
تو کیوں ہے عمل سے بیگانہ اے کیفِ خودی کے متوالے
تیور تو دیکھ زمانے کے

اور جب یہ بدلے ہوئے تیور ۱۹۴۷ء کی مسکراہٹ بن گئے تو اس منزل پر بھی عرش کی شاعری نے تقلید کے خلاف بغاوت کی، مذہب کی چیرہ دستیوں کے خلاف آواز اُٹھائی اور آزاد ہندوستان کی ترقی و بہبود کے جذبہ سے معمور ہوتی رہی۔ اس کے مثال میں اُن کی دو نظمیں "جشنِ آزادی ۱۹۴۸ء" اور "رشوت کا بازار" پیش کی جاسکتی ہیں۔

برق رفتار پہ اپنی رشک کرتا تھا جہاں — سوئے آزادی ہمارا قافلہ تھا تیز گام
سیکھنا ہے لیکن اب میخانۂ تعمیر میں، — جنبشِ نبضِ تمنّا و خرامِ دورِ جام

آگے چل کر یہ نظم وعظ بن جاتی ہے۔

عیش کے ساماں بھی ہوں اور فرض کا احساس بھی — جشن بھی ہو غم زدوں کی ناز برداری بھی ہو
داخلِ آدابِ مے نوشی ہو ساقی کا ادب — مستیاں ہوں مستیوں کے ساتھ ہشیاری بھی ہو
حال کی خاطر خرد کوشی ہے مستحسن مگر — بہرِ مستقبل جنونِ ذوقِ بیداری بھی ہو

اسی طرح "رشوت کا بازار" میں ایک تعمیری جذبہ کارفرما ہے۔

لیڈر قسم کے لوگ بھی کچھ رشوت کے متوالے ہیں — جتنے اُجلے کپڑے ہیں اُتنے ہی دل کالے ہیں
دھرم کی باتیں رہنے دو حسنِ عمل کا ذکر کرو — قوم کی عزت لٹتی ہے کچھ اس کی بھی فکر کرو

اُسی ۴۸ء کی ایک نظم "جہل کی رات" ہے یہ وہ وقت تھا کہ جب کہ ۴۷ء کی مسرتوں کا جادو ملک کے گوشے گوشے پہ طاری تھا۔ ہندوستان غلامی کی ایک بھیانک تاریک رات طے کر چکا تھا۔ لیکن عرش ۴۸ء کو رات کہتے ہیں کیونکہ سیاستِ وقت کو اُن تاریکیوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔ یہ نظم بڑی ہی مکمل اور حسین ہے۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے:۔

عقل کی صبح کہاں جہل کی ہے رات ابھی — ذہنِ انسان میں ہیں فرسودہ خیالات ابھی
پائے عالم میں ہے زنجیرِ قدامت اب تک — گردنِ دہر میں ہے طوقِ روایات ابھی
طاقتِ جستِ عمل سے ہیں ابھی دل محروم — زینۂ عقدہ کشائی ہے مناجات ابھی
دل میں انسان کے ہے وحشت اشراق ہنوز — ثبت اذہان پہ ہے مہرِ کرامات ابھی
رہبرِ راہِ تعقّل کا خدا حافظ ہے — راہ میں وہم کے لاکھوں ہیں مقامات ابھی
ابھی ممنوع ہے دارائی شرح و تفسیر، — ناز فرما ہیں اشارات و کنایات ابھی
خندۂ دلکش و گلدستۂ رنگیں کے عوض — خنجر و تیغ سے ہوتی ہے مدارات ابھی

اس نظم میں وہ چیز جسے "روحِ عصر" کہتے ہیں محسوس کی جاسکتی ہے۔ اشارات کے پردوں میں دردناک ہنگامی تاثرات چھپے ہوئے ہیں۔ اسی بنا پر یہ نظم عروج پر پہونچ کر طنزیہ ہو جاتی ہے۔ یہ طنز ایسا نہیں جسے آپ منفی پہلو قرار دے کر گزر جائیں۔ آپ اس کے زہر کو پینے پر مجبور ہوں گے۔ مثلاً:

آشیاں امن کا اب تک نہیں مسجودِ بشر — آستاں جنگ کا ہے قبلۂ حاجات ابھی
گرہِ زیست کے ہیں عقدہ کشا ناخنِ مرگ — خدمتِ امن میں داخل ہیں فسادات ابھی
عرش کیوں خواب سے بیدار ہوا جاتا ہے — بند کر آنکھ کہ باقی ہے یہاں رات ابھی

اس طرح ۴۸ء کے بعد عرش کی شاعری ایک ایسی منزل پر پہونچ گئی ہے جہاں اُن کا طائرِ خیال نئی فضاؤں میں پرواز کر کے نیا آشیانہ ڈھونڈھتا ہے۔ اُن کے خیالات وسیع ہوتے ہیں اور اسی تجسس اور بے ہنگی میں وہ ابھی تک مصروف ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ اِن دنوں سرتاسر ملحد، امن دوست، انقلابی اور اشتراکی سب کچھ نظر آتے ہیں اس سلسلہ کی نظموں میں ۴۹ء کی "غمِ ماحول" ۵۰ء کی "کم ظرف دنیا" اور "جب آدمی وحشی بن گیا" اور "اے پیرِ خرابات!" قابلِ ذکر ہیں۔

فروغِ جاں نہ ہوگی روشنی کب تک بصیرت کی — رہیں گے داغِ دل بن کر جہالت کے نشاں کب تک

ہنسی کب تک اُڑے گی عظمتِ اولادِ آدم کی
جو دھرم پہ بیتی دیکھ چکے "ایماں" پہ جو گزری دیکھ چکے

قتل و غارت کے ہزار و داغ لے کر وحشتیں،
یوں کبھی مذہب کی قدروں کو نہ انساں چھوڑتا
جن خطاؤں پر درِ جنّت ہوا آدم پہ بند

خُردی و بزرگی کی یہاں جنگ نہیں ہے
پستی و بلندی کا کہیں رنگ نہیں ہے
ہر دل ہے کشادہ کوئی دل تنگ نہیں ہے
جھگڑوں کی بنا نسل نہیں رنگ نہیں ہے

(غم کا ماحول)

رہے گی آدمیت ایک جنس رائگاں کب تک
اس "رام" "رحیم" کی دنیا میں انسان کا جینا مشکل ہے

(کم ظرف دُنیا)

آج سنتے ہیں کہ پھر عصمت بداماں ہو گئیں
اے خوشا وہ خود بلائے جانِ انساں ہو گئیں
وہ خطائیں ہی بنائے بزمِ امکاں ہو گئیں

(جب آدمی وحشی بن گیا)

رندوں نے ترے فیض سے سیکھی ہے مساوات۔ اے پیرِ خرابات!

عرش نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ اُن کی غزلیں جس خوبی سے نئی شاعری اور نئے خیالات سے متاثر ہوئی ہیں اُس کی مثال موجودہ دور میں صرف چند شعرا کے یہاں ملے گی۔ عرش کی غزلیں اُن تمام کمزوریوں سے پاک ہیں جسے روایتی شعراء بڑے فخر سے مقصودِ شاعری سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ دور از کار تشبیہیں، بعید از قیاس استعارے، دقیق تلمیحات کی روایتیں اور دل میں کراہیت پیدا کرنے والے عاشق معشوق کے چونچلے، ماورائیت، غیر طبعی اور بے کار خیالات، عرش کی غزلوں میں ڈھونڈھنے سے بھی نہ ملیں گی۔ یہ ممکن ہے کہ انھوں نے "عاشق" کا بھی ذکر کیا ہو "لیلیٰ و شیریں" کے تذکروں کو بھی لے بیٹھے لیکن ان سب کے باوجود اُن کی غزلوں کا مزاج بدلنے نہیں پایا۔ اُن کی غزلوں میں روحانیت اور مادیت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ فکر کے دوش پر انھیں اگر عرش کا جلوہ نظر آتا ہے تو انسان کی بے پناہ قوتوں اور حکمتوں کے سامنے فرش بھی ہو جاتے ہیں۔ غزلوں کے معاملہ میں اُن کا تعلق فارسی اور اُردو کے کسی مخصوص شاعر سے نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ غزل کی نئی روش بندی کا اثر اُن پر بھی ہے۔ انھیں حسرت کہہ لیجئے یا فراق، لیکن ان دونوں کے کلام سے اُن کا کلام آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ دوسری اصنافِ شاعری کی طرح اُن کو غزل پر بھی قابو ہے اور یہ اعتراف بھی کرتے ہیں

اگر چاہوں تو ذرّے میں ضیا خورشید کی بھر دوں
اگر چاہوں حزف کو آب میں رشکِ گہر کر دوں
اگر چاہوں تو قطرے کو سمندر کر دکھاؤں میں
اگر چاہوں بگولا بن کے صحرا کو اُڑا لاؤں
اگر کہنے پہ آجاؤں بقا کو لافنا کہہ دوں
زمیں کو عرش کہہ دوں عرش کو تحت الثریٰ کہہ دوں

انھوں نے یہ اعتراف ۳۳ء میں کیا ہے۔ اُس دور کی غزلوں میں حُسن و عشق کے جذبات پاکیزگی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں اور یقیناً اُس وقت تک اُردو غزل کو حسرت، فانی اور اصغر جیسے مجدّد مل چکے تھے۔ عرش کے یہاں اِن شعراء کے اثرات اور نشانات ملتے ہیں

لے نہ ڈوبے کہیں خوش فہمیِ ادراک تجھے
ناخدائی تری پوشیدہ اسی راز میں ہے
حسرت افزا ہے میرے مصائب کی داستاں
دل کو ترے خیال سے بہلا رہا ہوں میں
جنھیں اعمال پر خفت گناہوں پر ندامت ہے
کسی کے عیب کا دنیا میں وہ چرچا نہیں کرتے
دیر و حرم سے اور تو حاصل نہ کچھ ہوا
سجدے غرورِ عشق کی قیمت گھٹا گئے
طے کر گیا جنوں مرا اک جست میں انھیں
حیرت سے مجھ کو کون و مکاں دیکھتے رہے

یہ ۳۸ء کی غزلوں کا رنگ ہے۔ ان غزلوں میں خوفِ خدا بھی ہے اور خوفِ انسان بھی۔ واعظ سے نفرت بھی اور مذہب

عشق سے عقیدت بھی۔ لیکن زبان کی صفائی اور بیان کی پختگی کے ساتھ اخلاص و سوز مندی بھی ہے۔ یہی خلوص و سوز مندی تو اصل شاعری اور صحیح آرٹ ہے۔

بعد میں سیاسی اور قومی خیالات کا نشہ اُن کی غزلوں پر سرور بن کر چھا گیا۔ وہ جیوں جیوں دُنیا کے "مکروہات" سے قریب تر ہوگئے اُن کا نشہ تیز ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُن کی بھی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ یہ آنکھوں کا سُرخ ہونا بُری بات ہے۔ یہ کسی بھی شاعر کی شاعری کو جلسہ کا اشتہار بنا سکتا ہے اور اگر ایسا ہو تو شاعر اور ادیب کی شکست و ریخت کی قوتیں فروغ پاتی ہیں۔ یہ بات کہاں سے نکل آئی۔ میں عرش کی ۴۲ء کی غزلیں پیش کرنا چاہتا ہوں:۔

ہے قناعت جو ایک جلوے پر — شوق ابھی تنگدست ہے شاید
ہاں اور اُٹھا پردے کو اے پردہ نشیں اور — مجھ سا نہیں کوئی ترے جلووں کا امیں اور
کافی نہیں مجھ کو یہ نگاہِ غلط انداز — ہاں اور بڑھا حوصلۂ قلبِ حزیں اور
ہم مرتبہ عرش کوئی ان میں نہ ہوگا — ہوں گے درِ جاناں کے بہت خاک نشیں اور
وفورِ خرد کی عنایت کے صدقے — جنوں تیز ہوتا گیا زندگی کا
زباں سے کچھ کہو صاحب مگر معلوم ہے ہم کو — تمہارے دل کی سب باتیں ہمارے دل کی باتیں ہیں

"صاحب" کتنا واضح اشارہ ہے۔ یہ ۴۲ء کی بات ہے لیکن ۴۹ء میں تو وہ اور تیز ہوگئے اور ایسا محسوس ہوا جیسے غزل جسے وہ پردہ کی بہو بنائے ہوئے تھے امور خانہ داری سے تنگ آکر بے شرم ہو کر تیز تیز آنکھیں دکھا رہی ہو۔

مطمئن ہے کیوں رہائی پر روایت کے اسیر — پھاند کر دیوارِ زنداں کو اسے ڈھانا بھی ہے
پھر کوئی پُرسوز نعرہ عصرِ حاضر کے نقیب — گرم ہو کر آج اہلِ دل کو گرمانا بھی ہے
تُو بھی ہے اک تال بھی اک سم بھی اک گانا بھی ہے — زندگی عنوانِ افسانہ بھی، افسانا بھی ہے

یہ انساں کی بے چارگی ہائے توبہ — دُعاؤں کے باقی ہیں اب تک سہارے
غنیمت ہے یہ ماحصل زندگی کا، — دلے دلربائے، غمے غمگسارے
ہم آغوشِ طوفاں تو ہونا ہے اک دن — سنبھل کر چلیں کیوں کنارے کنارے

غرض اُن کی نظموں کی طرح غزلوں میں بھی اُن کے تخلیقی شعور کے ارتقائی سلسلے ملتے ہیں۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے یہاں انقلاب دبے پاؤں داخل ہوا ہے۔ لٹیروں کی طرح دن دہاڑے نہیں۔ چنانچہ اُن کا انقلاب اپنے گرد و پیش کا جائزہ بھی لیتا ہے اور مقصد کی خبر بھی رکھتا ہے۔ اُن کے گرد و پیش متوسط طبقہ کی روایتیں اور مذہب و اخلاق کی بندشیں ہیں اور اسی لئے۔

اس انتہائے ترکِ محبت کے باوجود — ہم نے لیا ہے نام تمہارا کبھی کبھی

عرش نے قلبی واردات اور حسّی کیفیات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اشعار کے پردوں میں رومان پرور نظاروں اور نغمہ بار فضاؤں کی دلکشی نے بھی تاک جھانک کی ہے۔ "آمدِ شباب" اُن کی وہ رومانی نظم ہے جس میں عنفوانِ شباب کے سادہ و رنگین جذبات پیش کئے گئے ہیں لیکن "کلفٹن" کی منظر کشی میں اُن کے جوان کے دل کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔

اک رقص کے عالم میں کمسن بھی مُسن بھی — یا چوکڑی بھرتے تھے ہرن اور چکارے
وہ چومنا اُڑ اُڑ کے بدن سیم تنوں کا — پانی کی یہ چھینٹیں تھیں کہ سیماب کے پارے

لیکن نظم کی انتہا سوز و حسرت پر ہوتی ہے۔

دل ہنس دیا اک کافرہ کی یاد میں رو کر — جب وہ نہیں جذبات کو پھر کون اُبھارے

"کافر" کے بجائے "کافرہ" صحت مند اقدام ہے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا ذوق و شوق فطری اور بالکل نظری ہے۔ اسی طرح "تو ہی مجھ سے کہدے میں کیوں بھول جاؤں" میں انھوں نے شوق و بے تابی کے نشاط انگیز مناظر پیش کئے ہیں اور آخر میں خاتمہ سماج کی قدامت پسندی پر ہوتا ہے۔

وہ ناگاہ فرقت پہ مجبور ہونا — فریب مقدر کی وہ چیرہ دستی
خمارِ مئے عیش اور نامرادی — وہ مرگِ تمنّا وہ انجامِ مستی
رسومِ کہن کی ستم آفرینی — زمانے کا جورِ قدامت پرستی
تو ہی مجھ سے کہدے میں کیوں بھول جاؤں

عرش کی سماجی نظموں میں "سہاگن بیوہ" کی رقت انگیزی بڑا نادر اور اچھوتا موضوع ہے۔ "بیوہ" ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی روایتوں میں سب سے زیادہ مکروہ اور ذلیل روایت ہے۔ شعراء ہند کی ایک بڑی تعداد نے "بیوہ" کو موضوع شاعری بنایا ہے۔ لیکن سہاگن بیوہ ایک مخصوص مشاہدہ کی چیز ہے۔ ممکن ہے عرش کا اشارہ مسلم تہذیب کی طرف ہو جس میں کثرتِ ازدواج کو سنّت اور دین کی محافظت بھی حاصل ہے اور ایک بیوی کو اپنی تمام مہر و محبت کی آماجگاہ بنا کر دوسری بیوی کے کیف و نشاط سے رشتۂ ازدواج کو آلودہ کرنا عام سی بات ہے۔ اخلاق و مذہب کے علمبردار ایسے مظالم کو عین منشائے خداوندی قرار دے کر خاموش ہو جاتے ہیں لیکن پہلی بیوی اپنی وفا شعاریوں کے باوجود اس دردناک منظر کی تاب نہیں لا سکتی۔ عرش نے موضوع کو جس سچائی کے ساتھ پہلی بیوی کے ماضی و حال کے آئینے میں پیش کیا ہے اُس سے ایک لاجواب نظم کا صحیح لطف ملتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

کیوں وفاؤں کو کروں آلودۂ فریاد میں — دوسری شادی پہ دیتی ہوں مبارکباد میں
مجھ کو بھی ماں باپ سے روتی ہوئی لائے تھے آپ — گرم گرم اشکوں سے منھ دھوتی ہوئے لائے تھے آپ

گرم گرم اشکوں کی مالا لے کر عروس کا جدا ہونا ہندوستانی سماج کی تصویر ہے:-

میں نے بھی کچھ سوچ کر چھوڑا تھا گھر ماں باپ کا — میں نے بھی دل دے کے پایا تھا سہارا آپ کا
رتجگا وہ اور ارمانوں کے طوفاں یاد ہیں — مجھ کو پہلی رات کے وہ عہد و پیماں یاد ہیں
اے مرے محبوب میری چشمِ گریاں کی قسم — دردِ دل کی حسرتوں کے جوشِ طوفاں کی قسم
کچھ کہو کیا آپ کو بھی وہ زمانہ یاد ہے — عشق کی رنگینیوں کا وہ فسانہ یاد ہے

اور آخر میں یہ دُعائیں بھی ہندوستانی بیوی کی وفا شعاریوں کی آئینہ دار ہیں۔

آپ کو حاصل دُلہن کی ناز برداری رہے — اُس کے پرتیم آپ ہوں وہ آپ کی پیاری رہے
آپ کی آنکھیں ہوں عشرت کے نظاروں کے لئے — آپ کا باغِ محبت ہو بہاروں کے لئے

"ساقی، شراب اور شباب" سے مدہوش چند رباعیاں بھی عرش کے احساسِ شعر و نغمہ کو اُجاگر کرتی ہیں۔ ان میں سرتاسر کیف و بے خودی بھی ہے اور فکر و عمل کی دعوت بھی۔ شیراز کی محفلوں کا ادب بھی ہے اور ہند کے میخانوں کا اجتہاد بھی۔ ضمناً دو رُباعیاں پیش کی جاتی ہیں:-

ساقی نے کہا غیرتِ ناہید ہوں میں — مے بول اُٹھی جلوۂ امید ہوں میں
ساغر سے چھلک کر جو زمیں تک پہونچی — ہر ذرہ پکار اُٹھا کہ خورشید ہوں میں

ساقی نے کہا دور مئے ناب شروع — بھاگیں مری محفل سے سجود و رکوع
گل کر دو ذرا شمع سرِ مے خانہ — ہوتا ہے مرے جام سے خورشید طلوع

عرش نے عوامی گیتوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور اُن کے ہفت رنگ کی آخری کرن یہی صنف ہے۔ انھوں نے قصیدہ، مرثیہ، ہجو اور تاریخ کہنے کی جسارت نہیں کی لیکن یہ گیت لکھ کر اس نئی صنفِ شاعری کا تجربہ کیا ہے۔ نئے شعرا ان دنوں تیزی سے گیت لکھ رہے ہیں اور گیت کے لئے نہ تو کوئی باقاعدہ تکنیک اور نہ کوئی اچھا تجربہ۔ عام طور پر گیتوں میں ہندی کے چند نافہم الفاظ کو چلتی پھرتی اُردو کے ساتھ شامل کر دیا جاتا ہے۔ غروب آفتاب پر پنگھٹ پر حسینوں کا ہجوم یا ساون کی جھڑی میں پریتم کی یاد کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ عرش نے کسی نئے موضوع کا انکشاف نہیں کیا ہے۔ اور اُن کا تجربہ بھی کامیاب نہیں ہے۔ اُن کے تمام گیتوں میں "جیون درپن دیکھ لیا" اور "ہمارا دیش" بہرحال کامیاب ہیں۔ "ہمارا دیش" اچھا گیت ہے اور اس قابل ہے کہ اسے داخلِ نصاب کیا جائے، خصوصیت کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا یہ انداز لائقِ تحسین ہے۔

رجنی، راشد، سلمیٰ، موہن — مل کر گائیں گیت یہ پیارا
دیش ہمارا سب سے نیارا — سب سے پیارا دیش ہمارا

مندرجۂ بالا چند سطور میں عرش ملسیانی کی شاعری کا جو اجمالی جایزہ لیا گیا ہے اُس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عرش اپنے دور کے ایک بہترین نمایندہ ہیں۔ انھوں نے استفادہ اور اختراع، روایت اور بغاوت، اتباع اور اجتہاد کے ملے جلے اقدام کی بنا پر اپنی اپنی شاعری کو اس قدر صحت مند اور توانا بنایا ہے کہ اُسے اُردو کے ہر گروہ اور طبقہ میں مقبولیت حاصل ہوگی۔ عرش پنجابی پنڈت ہیں اور اس لحاظ سے جناب فراق صاحب کی طرح اُن کی شاعری بھی بدنام "فرقہ واری زبان" اُردو کی آبرو ہے۔ اُن کا کلام فن کارانہ ہے۔ زبان صاف اور شستہ ہے اور خیالات پر زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا اثر ہے وہ اپنی روایتوں اور کمزوریوں کے باوجود آنے والے تمام ادوار میں عزت و احترام سے یاد کئے جائیں گے۔ ویسے تو عیوب سے یکسر پاک ہونا منشائے انسانیت کے خلاف ہے اور اُردو کے کس دور کا وہ کون اچھا شاعر ہے جس کے یہاں بُرے اشعار اور بُرے خیالات قطعی مفقود ہیں۔ بقول عرش

عیب سازوں سے ہیں افسردہ ہنرمند اب تک
نقص بازوں سے ہیں آزردہ کمالات ابھی

نگار کے پچھلے تین سالنامے

سالنامہ ۱۹۳۷ء — جس میں علم "فراست التحریر" کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سوادِ خط دیکھ کر اس کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ صرف ایک کاپی باقی ہے ——— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۳۷ء — اس میں "ڈرامہ اصحاب کہف" اڈیٹر کے قلم سے پورا شایع ہوا ہے اور "خلافت و امامت" کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہوا ہے ——— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۳۸ء — اس میں "تاریخ اسلامی" کے عہدِ خلافت و امامت پر مختتم بحث کی گئی ہے جس کی ابتداء ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی ——— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

قانونِ تجاذب

کپلر کے اصول ثلاثہ

اور

نیوٹن کا نظریۂ کشش اجرام

(نیاز فتحپوری)

یہ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ جب وہ کسی پتھر کے ٹکڑے کو اوپر سے چھوڑتا ہے تو وہ سیدھا زمین پر گر جاتا ہے اور اس واقعہ سے اُسے کوئی حیرت بھی نہیں ہوتی، لیکن اگر ہمارے سامنے مقناطیس کے ذریعہ سے کوئی لوہے کا ٹکڑا کھینچ لیا جائے، یعنی اگر کوئی آہنی چیز کسی پارۂ مقناطیس سے آکر متصل ہو جائے تو ہم اس کو نگاہ تعجب سے دیکھیں گے، درانحالیکہ وہ قانونِ فطرت جو ایک وزنی چیز کو زمین کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ اسی قدر دلچسپ ہے جس قدر کشش مقناطیس کے اصول۔

جس طرح مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے اُسی طرح زمین بھی تمام اشیاء کو اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ مقناطیس کا یہ عمل بہت کم اشیاء پر ہوتا ہے اور زمین کی کشش بہت عام، وسیع اور عالمگیر ہے۔

تم اپنے ہاتھ میں سیسے کا ایک ٹکڑا لو اور زمین کی طرف اُسے چھوڑ دو تو سب سے پہلے تم یہ محسوس کرو گے کہ سیسے کے ٹکڑے کو زمین تک پہونچنے میں کچھ وقت صرف ہوا۔

اب تم دوسرے ہاتھ میں اُس ٹکڑے سے زیادہ وزنی ٹکڑا لو اور دونوں کو ایک ساتھ چھوڑو تو دونوں زمین پر ساتھ ہی ساتھ گریں گے۔ حالانکہ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زیادہ وزنی چیز زیادہ تیزی کے ساتھ زمین کی طرف آئے گی اور ہلکی چیز کم تیزی کے ساتھ، یہ غلط ہے۔ تم ہر وقت تجربہ کر سکتے ہو کہ جب دو مختلف وزن کی چیزوں کو ایک ساتھ چھوڑا جائے گا تو وہ ساتھ ہی ساتھ زمین پر گریں گی۔ یہاں تک کہ اگر تم ایک ہاتھ میں بوتل کا کاگ لو جو بہت ہلکا ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں سنگ مرمر کا ٹکڑا یا لوہے کا ٹکڑا اور دونوں کو ایک ساتھ چھوڑو تو یہ دونوں زمین تک ایک ہی ساتھ پہونچیں گے۔

اگر تم ایک ہاتھ میں پر لوگے اور دوسرے ہاتھ میں لوہے کا ٹکڑا تو پر کو زمین تک پہونچنے میں زیادہ دیر لگے گی لیکن اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ پر کو ہوا آسانی کے ساتھ روک سکتی ہے اور وہ ہوا میں تیرتا ہوا زمین کی طرف آتا ہے۔ برخلاف ایک وزنی چیز کے کہ ہوا اس کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوتی اور وہ دفعتہً زمین پر آجاتی ہے لیکن اگر تم اس پر کو کسی پیسہ کے اوپر رکھو اور پھر پیسہ کو ترچھا کر کے چھوڑو تو پر بھی ساتھ ہی ساتھ آئے گا کیونکہ اس صورت میں پیسہ کے وزن یا ثقل نے پر کے لئے راستہ صاف کر دیا اور ہوا اس کی مزاحم نہیں ہوئی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ایک چیز کا ہلکا یا بھاری ہونا غیر معتبر ہے اور ایک متعین بلندی سے جب مختلف اوزان کی چیزیں زمین کی طرف چھوڑی جائیں گی تو وہ ایک ہی ساتھ اور ایک ہی وقت میں زمین پر گریں گی۔

مختلف طریقوں سے اس کا تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ زمین تک آنے میں ایک چیز فی سکنڈ ۱۶ فٹ کا فاصلہ طے کرتی ہے یہانتک کہ ایک بوتل کا کاگ اور اس سے بھی زیادہ ہلکی چیز ۱۶ فٹ کی بلندی سے صرف ایک سکنڈ میں زمین تک پہونچ جائے گی یہ اصول اس قدر عام اور مستحکم ہے کہ دُنیا کے جس حصہ میں یہ عمل کرو گے نتیجہ ایک نکلے گا البتہ مختلف مقامات میں تجربہ کرنے سے خفیف سا

فرق ضرور محسوس ہوگا، لیکن اس کے اسباب کچھ اور ہیں جن کا بیان کرنا یہاں ضروری نہیں اور جو کششِ ثقل کے اصول پر موثر نہیں ہوتے۔ اب اس نظریہ کو پیشِ نظر رکھ کر یہ دیکھنا چاہئے کہ سطح زمین سے اوپر بلندی میں کس حد تک یہ حقیقت باقی رہتی ہے۔ اس غرض کے لئے اگر کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں ایک وزن کو نیچے تک آنے میں بہ نسبت سطح زمین کے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ ہر چند یہ فرق بہت کم ہوگا تاہم اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اگر ہم اور بلندی پر چڑھ جائیں تو یہ قانونِ تجاذب تو وہاں بھی جائے گا، لیکن بعد زمین کے ساتھ ساتھ اس میں کمی ضرور ہوتی جائے گی۔

ہم غبارہ میں بیٹھ کر پانچ چھ میل سے زیادہ بلند نہیں جاسکتے، لیکن فرض کرو کہ ایک شخص ڈھائی لاکھ میل زمین سے بلند ہوجائے اور وہاں سے وہ کسی وزنی چیز کو نیچے کی طرف چھوڑے تو وہ اول نظر میں محسوس کرے گا کہ وہ چیز معلق ہوکر ایک جگہ قایم ہوگئی ہے اور نیوٹن کا یہ نظریہ کہ قانون تجاذب اس قدر بلندی پر بھی اپنا کام کر رہا ہے غلط ثابت ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ مگر تھوڑی دیر میں معلوم ہوگا کہ وہ چیز نہایت آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جارہی ہے اور جس قدر نیچی ہوتی جاتی ہے اس کی سرعت رفتار بڑھتی جارہی ہے۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ڈھائی لاکھ میل کی بلندی سے یہ تجربہ کرنا ناممکن ہے، اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ واقعی وہاں قانونِ تجاذب پایا جاتا ہے یا نہیں، لیکن یہ اعتراض غلط ہے کیونکہ اتنی ہی دور اس کا تجربہ اب بھی ہو رہا ہے اور ایک چیز اتنی ہی دور سے زمین کی طرف کھنچی چلی آرہی ہے اور وہ چیز چاند ہے۔ پھر چونکہ ہم اس کا بھی اندازہ کرسکتے ہیں کہ چاند زمین کی طرف فی سکنڈ کس رفتار سے کھنچ رہا ہے، اس لئے ہم زمین کی قوتِ کشش کو بھی اچھی طرح معلوم کرسکتے ہیں۔ یہی تھی وہ حقیقت جس نے نیوٹن کو بتادیا کہ اگر کوئی چیز دو لاکھ اُنتالیس ہزار میل کی بلندی سے بھی (جو بلندی چاند کی ہے) چھوڑی جائے گی تو زمین اُسے اپنی طرف کھینچ لے گی۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ زمین کی قوتِ کشش فاصلہ کے لحاظ سے کس قدر کم ہوتی جاتی ہے اس کے متعلق ماہرینِ ہیئت نے متعدد تجربے کئے اور آخر کار اس نتیجہ پر پہونچے کہ زمین سے اوپر ہم جس قدر بلند ہوتے جائیں گے اسی نسبت سے ریاضی کے ایک متعین اصول کے تحت وزن بھی کم ہوتا جائے گا، جو عبارت ہے زمین کے جذب مرکزی سے۔ اس کو اس طرح سمجھنا چاہئے کہ اگر کوئی چیز چار پونڈ وزن کی مرکز زمین سے چار ہزار میل بلند پہونچ جائے گی تو اس کا وزن صرف ایک پونڈ رہ جائے گا۔

اس تجربہ کے ماتحت جب ریاضی سے مدد لی گئی تو حسب ذیل اصول قرار پائے :-

$$\text{وزن} \div \{ (\text{فاصلہ} + \text{نصف قطر زمین}) \div \tfrac{1}{2} \text{ قطر زمین} \}^2$$

یعنی جو فاصلہ مرکز زمین سے اس چیز تک ہے اس کو نصف قطر زمین سے تقسیم کرنے کے بعد جو خارج قسمت حاصل ہو اور پھر اسکے مربع سے وزن کو تقسیم کیا جائے تو جو نتیجہ حاصل ہوگا وہی وزن ایک چیز کا ہوگا۔ چنانچہ اس پر قیاس کرکے ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ اگر یہی چار پونڈ وزن کی چیز آٹھ ہزار میل تک پہونچادی جائے گی تو اس کا وزن صرف $\frac{4}{9}$ پونڈ رہ جائے گا اور اگر چاند کی سطح تک پہونچ جائے گی جو تقریباً دو لاکھ چالیس ہزار میل مرکز زمین سے دور ہے تو اس کا وزن صرف $\frac{1}{3600}$ پونڈ رہ جائے گا۔

یہ ایک نہایت عام فہم اور معمولی صورت جذب زمین کے سمجھنے کی ہے ورنہ حقیقتاً یہ مسئلہ بہت مشکل ہے علی الخصوص اس وقت جبکہ تجاذُب کے اصول تمام اجرام فلکی سے وابستہ ہیں اور فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے تمام کُرے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔

یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ زمین چاند کو اور سورج زمین کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ چاند کیوں نہیں زمین پر ٹوٹ پڑتا اور زمین کیوں نہیں سورج سے ٹکرا جاتی۔ اسی طرح اگر اور تمام اجرام فلکی ایک دوسرے کو کھینچ رہے ہوں تو کیوں اُن میں باہم تصادم نہیں ہوجاتا، لیکن یہ ادنیٰ تامل معلوم ہوسکتا ہے کہ اگر تمام اجرام سماوی ساکن ہوتے تو باہم تصادُم ہوجاتا۔ مگر چونکہ اُن میں سے ہر ایک اپنے محور پر نہایت سرعت کے ساتھ گردش کر رہا ہے یعنی خود اس کے اجزا اپنے مرکز کی طرف کھنچ رہے ہیں

اسلئے دوسرے اجرام کی کشش کی مدافعت ہوتی رہتی ہے۔
ذیل کی صورت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے :-

(۱)

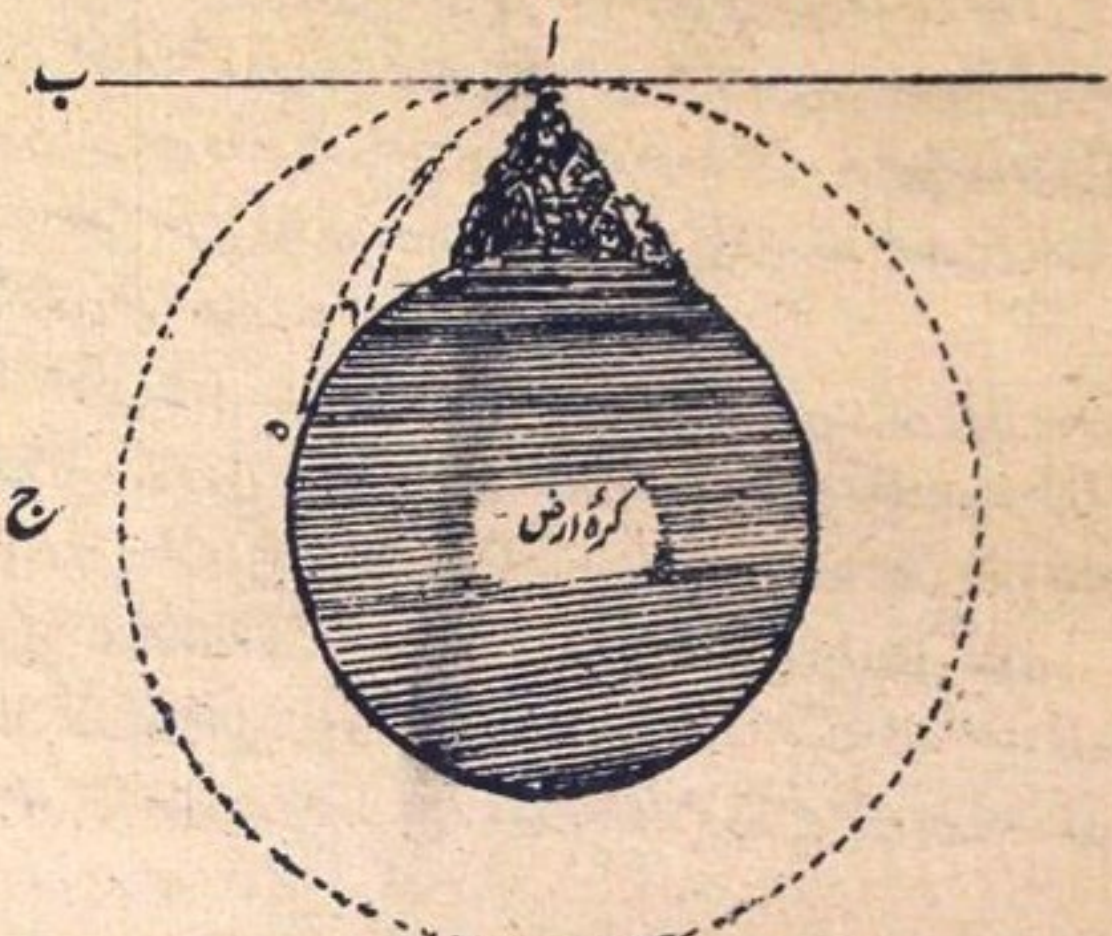

اگر ایک توپ معمولی قوت کے ساتھ مقام (ا) سے جو پہاڑ کی چوٹی ہے (ب) کی طرف سر کی جائے تو گولا فوراً ایک خمیدہ راستہ اختیار کرکے (د) کے اوپر گرے گا۔ اگر زیادہ قوت سے کام لیا جائے گا تو وہ اور آگے بڑھ کر مقام (ہ) پر گرے گا لیکن اگر کوئی نہایت قوی توپ بنائی جائے جو فی سکنڈ دس پندرہ میل کی رفتار سے گولے کو پھینک سکے تو وہ ا۔ج کا راستہ اختیار کرے گا۔ . . . . . اور اس کی سطح رفتار زمین سے اس قدر بلند رہے گی جتنی سر ہونے کے وقت قایم ہوئی تھی جب گولا نقطۂ ج پر پہونچے گا تو اس کی رفتار وہی قایم رہے گی اور وہ دائرۂ زمین کے دوسرے تیسرے اور تیسرے ربع کو طے کرکے آخر کار اسی نقطہ پر پہونچ جائے گا، جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔ اگر پہاڑ کی چوٹی جہاں سے وہ گولا روانہ ہوا تھا محو کردی جائے تو بھی وہ برابر معلق حالت میں گردش کرتا رہے گا۔

اب خیال کو اور زیادہ وسیع کرو اور سمجھو کہ اگر ایک توپ اتنی بڑی بنائی جائے جو دو ہزار میل قطر کے گولے کو تین ہزار فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے پھینک سکے اور دس لاکھ میل سطح زمین سے بلند کسی مقام سے سر کیا جائے تو یہ گولا نکل کر صرف چار ہفتے میں ساری زمین کا چکر لگا سکے گا اور پھر ہمیشہ اسی طرح گھومتا رہے گا۔

ایک شخص اس کو صرف وہم و گمان خیال کرے گا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایک گولا اتنا ہی بڑا زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے، جسے چاند کہتے ہیں۔ پھر جس طرح چاند زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے اسی طرح زمین آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے اور اجرام فلکی کا باہمی تجاذب ٹکراؤ سے محفوظ رکھتا ہے اس میں شک نہیں کہ اگر آج زمین ساکن ہوجائے یا چاند سے اس کی گردش سلب ہوجائے تو چاند زمین

سے اور زمین آفتاب سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں اسی طرح اور اجرام فلکی اپنی گردش ترک کر دیں تو وہ بھی آپس میں ٹکرا جائیں اور سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اصل چیز جو باعثِ کشش ہے اور جو منجذب ہونے کے ساتھ ہی قوتِ مدافعت بھی اپنے اندر رکھتی ہے وہ اجرام فلکی کی گردش ہے، اس لئے ہم بتانا چاہتے ہیں کہ گردش کا مفہوم کیا ہے۔

گردش دو قسم کی ہوتی ہے ایک گردش محوری کہلاتی ہے اور دوسری گردشِ دوری۔ گردشِ محوری سے تو کوئی کرہ خالی نہیں ہے ورنہ وہ قایم نہیں رہ سکتا۔ البتہ گردش دوری اُن ہی اجرام میں ہے جنھیں ہم سیارہ کہتے ہیں اور جو ہمارے نظام شمسی میں علاوہ اقمر اور دُم دار ستاروں کے اس وقت تک صرف نو دریافت ہوئے ہیں۔ ہم ان سیاروں کی گردش سے یہاں بحث کرنا نہیں چاہتے کہ اس کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے، البتہ اصول تجاذب کے سلسلہ میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ان سیاروں کی گردش دوری (ORBIT) کس صورت سے ہوتی ہے۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کے گرد سیاروں کی گردش بالکل دایرہ کی صورت میں ہوتی ہو گی اور اس سے قبل یہی یقین کیا جاتا تھا لیکن سب سے پہلے کپلر نے اس کی تردید کی اور دنیائے ہیئت میں اپنے اکتشاف سے بڑا زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ سیاروں کی گردش دائرہ کی طرح ہوتی ہے لیکن اُن سے مکمل دائرہ نہیں بنتا بلکہ بیضہ یا انڈے کی شکل کا ایک دائرہ بنتا ہے جسے انگریزی میں الپٹکل (ELLIPTECAL) اور عربی میں بیضاوی یا بیضاوی کہتے ہیں۔

کاغذ کے ایک تختہ پر الگ الگ کچھ فصل سے دو آلپین گاڑ دو اور موٹے تاگے کا ایک حلقہ اُن کے گرد ڈال دو اس کے بعد پنسل یا قلم کی نوک سے تاگے کو تان کر آلپینوں کے چاروں طرف ایک دائرہ کھینچو تو بیضاوی شکل بن جائے گی۔

(۲)

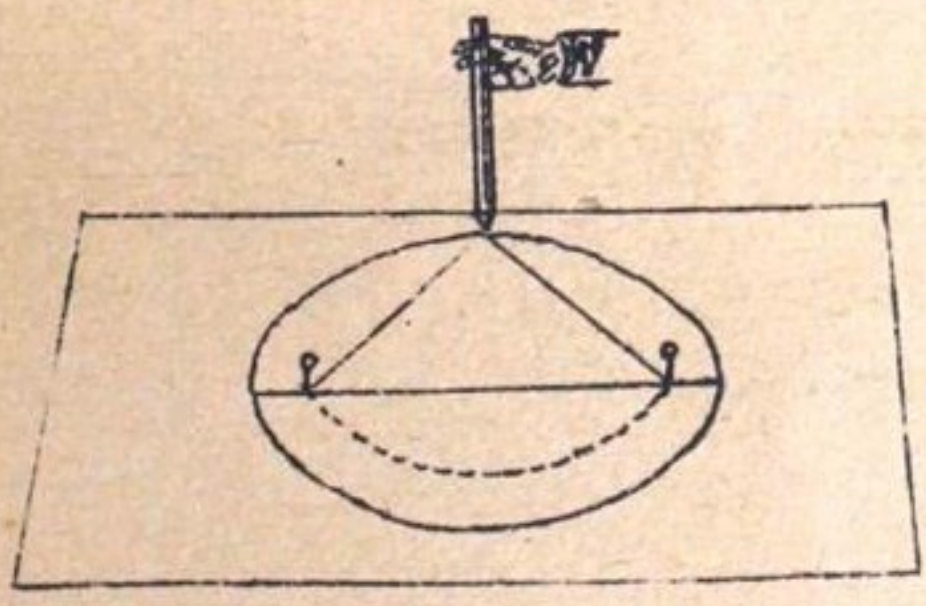

پھر جس طرح ایک دائرہ چھوٹا بڑا بن سکتا ہے اسی طرح آلپینوں کے قرب و بعد اور تاگے کو چھوٹا بڑا کرنے سے مختلف ناپ کے بیضاوی دائرے بن جائیں گے۔

ریاضی کے نقطۂ نظر سے ان دونوں مقامات کو جہاں آلپینیں نصب کی گئی تھیں فوسائی (Foci) اور عربی میں محترقین کہتے ہیں اور ان ہی دونوں نقطوں میں سے کسی جگہ آفتاب کا ہونا ضروری ہے۔

چنانچہ اسی اُصول کی بنا پر کپلر نے پہلا قاعدہ یہ مقرر کیا کہ:-

ہر سیارہ آفتاب کے گرد اہلیلجی دائرہ بناتا ہے اور آفتاب کا دونوں محرقین میں سے کسی ایک محرق پر ہونا ضروری ہے۔

جب یہ متعین ہوگیا کہ تمام سیارے آفتاب کے گرد اہلیلجی دائرے بناتے ہیں تو اب دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنی گردش کس طرح پوری کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر سیارہ ایک مدت معینہ کے اندر اپنی گردش پوری کرلیتا ہے لیکن یہ خیال کرنا کہ وہ ایک ہی رفتار سے چلتا ہے درست نہیں۔ مثلاً زمین ۳۶۵ ¼ دن میں آفتاب کے گرد اپنی گردش پوری کرلیتی ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ وہ ہر وقت اور ہر جگہ ۱۸ میل فی سکنڈ کی رفتار سے گزرتی ہوگی غلط ہے۔

اگر گردش بالکل دائرہ کی صورت میں ہوتی تو سیارہ کی رفتار یقیناً ہر وقت ایک ہی رہتی کیونکہ آفتاب عین مرکز پر واقع ہوتا اور اس کی کشش محیط یعنی دائرے کے ہر نقطہ پر یکساں ہوتی، لیکن چونکہ سیارے اہلیلجی دوائر بناتے ہیں اور آفتاب محیط سے دور و نزدیک ہوتا رہتا ہے، اس لئے اسی لحاظ سے سیارہ کی رفتار بھی تیز یا سست ہوتی رہتی ہے۔

(۳)

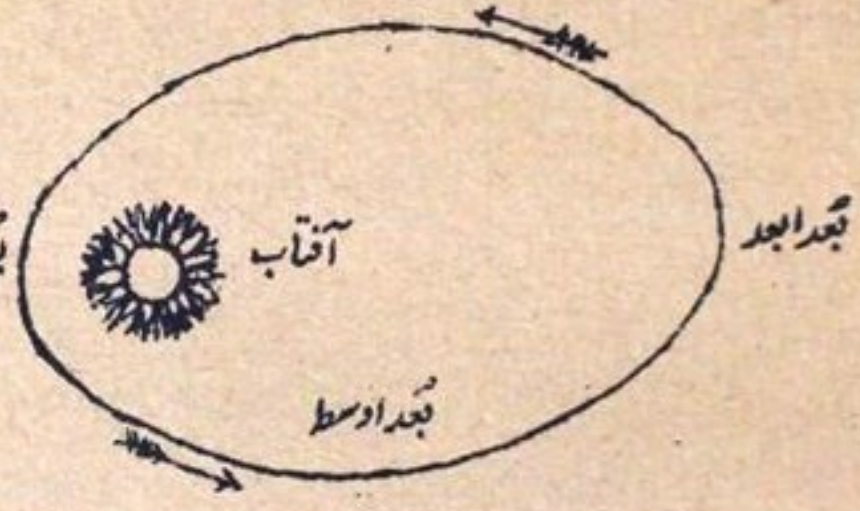

اس شکل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اہلیلجی دائرہ بنانے کی صورت میں سیارہ آفتاب سے بہت قریب ہو کر گزرتا ہے، ایک جگہ بہت بعید ہو کر اور دو نقطے ایسے ہیں جنھیں ہم بعد اوسط کہہ سکتے ہیں۔

پھر چونکہ آفتاب کے بعد و قرب کو کشش میں بڑا دخل ہے، اس لئے ظاہر ہے بعد البعد میں سیارہ کی رفتار بہت کم بعد اوسط میں متوسط اور بعد اقرب میں بہت زیادہ ہوگی۔ یہ مسئلہ ریاضی کی مدد سے بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

(۴)

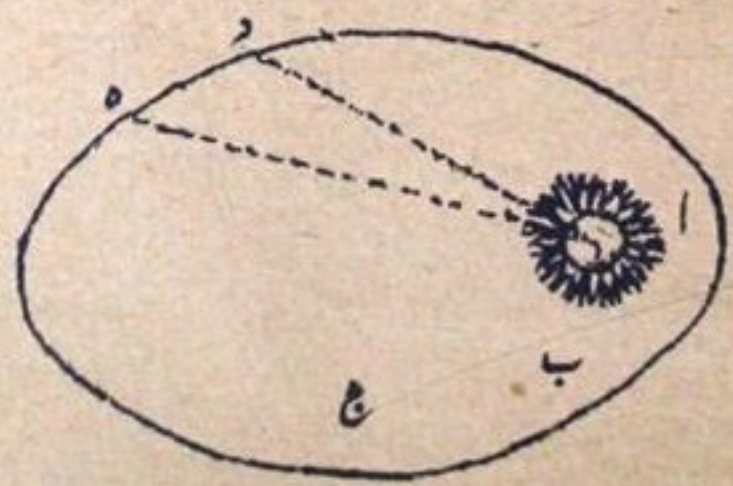

شکل مذکورۂ بالا میں ایک سیارہ کی گردش اہلیلجی دکھائی گئی ہے جس میں (ا) مقام آفتاب ہے۔ محیط میں سے ب۔ ج اور د۔ ہ دو قوس لے لئے گئے اور اُن سے مرکز آفتاب تک ایک خط کھینچ دیا گیا ہے فرض کرو کہ ا۔ ب۔ ج کا رقبہ ا۔ د۔ ہ کے برابر ہے تو ایک

سیارہ ان دونوں فاصلوں کو ایک ہی وقت میں طے کرے گا، لیکن ظاہر ہے کہ قوس ب۔ج جو قریب آفتاب کے ہے قوس د۔ہ سے بڑا ہے اس لئے کپلر کا دوسرا قاعدہ یہ قرار پایا کہ:۔

ہر سیارہ آفتاب کے گرد اس طرح حرکت کرتا ہے کہ اگر اس سے ایک خط مستقیم آفتاب تک کھینچا جائے تو وہ خط برابر اوقات میں برابر رقبوں سے گزرے گا۔

ان دونوں قاعدوں کے ساتھ کپلر نے ایک تیسرا قاعدہ اور قایم کیا جس سے دو مختلف سیاروں کی گردش کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے سمجھنے سے قبل یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ بعد اوسط کسے کہتے ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اہلیلجی گردش میں سیارہ کا فصل آفتاب سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور شکل نمبر ۳ میں بعد اوسط کی جگہ بھی بتا دی گئی ہے یعنی وہ بعد جو مدار کے تمام مختلف فاصلوں کا اوسط ہو۔ بعد اوسط اور بعد اقرب کو جمع کر کے نصف کر دینے سے بعد اوسط معلوم ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ہر سیارہ ایک مدت معینہ کے اندر اپنی گردش پوری کر لیتا ہے۔

جب یہ دونوں باتیں ذہن نشین ہو جائیں گی تو کپلر کا تیسرا قاعدہ سمجھ میں آجائے گا جس کے ذریعہ سے مختلف سیاروں کے بعد اوسط اور مدت گردش کی نسبت باہمی معلوم ہو سکتی ہے وہ قاعدہ یہ ہے کہ:۔

دو سیاروں کی مدت گردش کا مربع اُن کے ابعاد اوسط کے کعب کی نسبت سے ہوتا ہے۔

چونکہ کپلر کو معلوم تھا کہ ہر سیارہ کی مدت گردش مختلف ہے اور اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی آگاہ تھا کہ جس قدر بعد اوسط زیادہ ہوگا اسی قدر مدت گردش زیادہ ہوگی اس لئے اس نے یہ نسبت سمجھ لی۔ اُس نے یہ نہیں کہا کہ مدت گردش بعد اوسط کی نسبت سے ہوگی، کیونکہ اس صورت میں اگر کسی سیارے کا بعد اوسط دوچند ہوتا تو مدت گردش بھی دوچند قرار پاتی، حالانکہ بعض دور کے سیارے ایسے ہیں جو سہ چند مدت میں اپنی گردش پوری کرتے ہیں، ذیل کی مثال سے یہ قاعدہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

فرض کرو کہ زمین کا بعد اوسط ایک ہے اور مدت گردش ۳۶۵ء۳، اسی طرح زہرہ کا بعد اوسط ۷۲۳۳ء۰، اور مدت گردش ۲۲۴ء۷ ہے۔ اس لئے ۳۶۵ء۳ کے مربع ۲۲۴ء۷ کے مربع میں وہی نسبت ہوگی جو ان دونوں کے ابعاد اوسط کے کعب میں ہے۔

اگر زہرہ کی مدت گردش نہ معلوم ہوتی یا اُس کا بعد اوسط غیر معلوم ہوتا تو بھی وہ دریافت ہو سکتا تھا اور اسی طرح ہر سیارہ کی مدت گردش اور اس کا بعد اوسط معلوم کیا جا سکتا ہے۔

یہ تھے کپلر کے وہ تین اصول جنھوں نے نظام شمسی کو ایک منضبط صورت میں پیش کیا، کپلر یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور گردش اجرام کے متعلق جو تین اصول اس نے قایم کئے ہیں وہ کس سبب کے تحت منضبط ہوتے ہیں اس مسئلہ پر سب سے پہلے نیوٹن نے توجہ کی اور اُس نے ثابت کیا کہ یہ سب کچھ اجرام کے باہمی تجاذب و کشش کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی کرہ، جو فضا میں معلق ہے اور اس پر کسی دوسرے کرہ کا کوئی اثر نہیں ہے تو وہ کسی قوت سے حرکت دئے جانے کے بعد فضائے کائنات میں چل پڑے گا، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنا راستہ کس طرح متعین کرے گا۔ جس وقت ایک پتھر پھینکا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فضا میں وہ ہمیشہ ایک منحنی خط بناتا ہے، اس لئے ہم اس کرہ کے متعلق بھی خیال کر سکتے ہیں کہ وہ بھی اپنا مدار منحنی خط پر قایم کرے گا، لیکن یہ خیال غلط ہوگا کیونکہ زمین پر جو پتھر ہم پھینکتے ہیں اس پر خارجی قوتیں اپنا اثر ڈالتی ہیں برخلاف فضائے بسیط کے کہ وہاں اوپر، نیچے، پست و بلند کا کوئی مفہوم نہیں ہے اس لئے جب ہم یہ تسلیم کریں گے کہ کوئی قوت کشش کرۂ متحرک پر کام نہیں کر رہی ہے تو ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ خط مستقیم میں حرکت کر رہا ہے۔ لیکن چونکہ ان کی حرکت دائرہ دار ثابت ہو چکی ہے، اس لئے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کوئی قوت ایسی موجود ہے جو انھیں خط مستقیم سے منحرف کر کے انحناء کی طرف مایل کئے ہوئے ہے اور یہی وہ قوت ہے جسے جذب و کشش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کچھ "ذوقِ جنوں" کے بارے میں

(نظیر صدیقی)

شاعری عموماً ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز ہوا کرتا ہے۔ آلِ احمد سرور کی بھی ادبی زندگی شاعری ہی سے شروع ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام "سلسبیل" کے نام سے شایع ہوا تھا لیکن اس کے بعد سے وہ "کوشش کرکے نشر کی طرف متوجہ" ہوگئے اور اس انہماک کے ساتھ متوجہ ہوئے کہ لوگ انھیں شاعر کی حیثیت سے بالکل ہی بھول گئے۔ لیکن سرور نے شاعری سے اپنا رشتہ بالکل منقطع نہیں کیا ۱۹۴۶ء تک منھ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھی شعر بھی کہتے رہے۔ ۱۹۴۶ء کے بعد سے ان کی شاعری ان کی ادبی سرگرمیوں کا ایک باقاعدہ جزو بن گئی۔ چنانچہ نومبر ۱۹۵۵ء میں ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ "ذوقِ جنوں" کے نام سے شایع ہوا۔ اگر اس مجموعے کو "شاعری کی طرف سرور کی واپسی" سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس واپسی کے محرکات میں سے ایک کی طرف خود سرور نے یوں اشارہ کیا ہے:-

تھپک تھپک کے سلایا جو تم نے ذوقِ سخن
سرور اس کو کسی کی نظر جگا ہی گئی

سرور کے "ذوقِ سخن" کو بیدار کرنے میں "کسی کی نظر" کا جو حصہ ہے اس کا اعتراف ان کے ایک اور شعر میں بھی ملتا ہے:-

تیری ہی نگاہوں کا تصرف تھا کہ ہم نے
رعنائیٔ افکار کے اعجاز دکھائے

یہاں لفظ "افکار" خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ جس شاعری کی محرک "کسی کی نظر" ہو اس سے قدرتی طور پر یہی توقع ہوتی ہے کہ وہ جذبات کی شاعری ہوگی اور اس کا خاص موضوع حسن و عشق ہوگا۔ لیکن سرور کی شاعری کا بنیادی سرا (Key Point) "جذبہ" نہیں "فکر" ہے۔ "کسی کی نظر" نے ان کے دل کے تاروں کو چھیڑنے سے زیادہ ان کے ذہن کی لہروں میں جنبش پیدا کی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ موجودہ نسل کے دوسرے شاعروں کے برعکس سرور کی شاعری میں رومان کی حقیقت کی طرف، یا غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی طرف، تدریجی ارتقا نہیں ملتا بلکہ ان کے یہاں شروع ہی سے یہ دونوں عناصر یعنی رومان اور حقیقت یا غمِ جاناں اور غمِ دوراں ایک دوسرے میں مدغم نظر آتے ہیں۔ اس امتزاج کی طرف خود سرور نے یوں اشارہ کیا ہے کہ ؎

دہر کے کرب کا آئینہ ہیں اشعار مرے
اور اس آئنے میں عکس نگہِ ناز بھی ہے

"دہر کے کرب" کے معنی ساری دُنیا کے دکھ درد کے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ سرور کی شاعری ساری دُنیا کے دکھ درد کی آئینہ دار ہے۔ وہ چونکہ صرف بیدار مغز شاعر ہی نہیں بلکہ بالغ نظر نقاد بھی ہیں اس لئے وہ موجودہ عہد اور موجودہ نسل کے ذہن اور مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس ذہن کی پیچیدگی اور اس مزاج کی تلخی کا انھیں بھرپور احساس ہے۔ وہ اس پیچیدگی اور تلخی کے اسباب کو بھی سمجھتے ہیں۔ پچھلی دو عظیم جنگوں نے دُنیا کو اس موڑ پر لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں نور و ظلمت کی کشمکش، خواب و حقایق کے تصادم، یقین و شک کی آویزش اور ماضی و حال کے تضاد میں بڑی شدت پیدا ہوگئی ہے۔ موجودہ انسان جس قدر ارتقا کی

منزلیں طے کر رہا ہے اتنا ہی ذہنی سکون سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ مادی آسایش کے لوازمات جس قدر بڑھتے جا رہے ہیں روحانی نشاط اتنا ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج کا انسان جس قدر امن کے خواب دیکھتا ہے اتنے ہی جنگ کے بادل اس کے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ بظاہر وہ جس قدر جوش و خروش کا پیکر نظر آتا ہے حقیقت میں اس پر اتنی ہی بے دلی اور بے حسی طاری رہا کرتی ہے۔ اسے ہر شیرینی میں تلخی اور ہر شہد میں زہر محسوس ہونے لگا ہے۔ نہ اس کے قدم مضبوط زمین پر ہیں نہ اس کا دل صحیح جگہ پر۔ نہ اس کی راہیں آسان ہیں اور نہ اس کی منزلیں روشن۔ برق و بخارات کے عہد نے زندگی کی ساری قدروں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا ہے۔ اب نہ حسن میں پہلا سا تقدس ہے اور نہ عشق میں پہلی سی سپردگی اب محبت کی دیوانگی میں بھی فرزانگی کا انداز پیدا ہو گیا ہے اور عاشق پرستار سے زیادہ طلبگار بن گیا ہے۔ پچھلی نسل کے لوگوں کو اپنے شباب میں ساری دنیا جوان نظر آتی تھی۔ موجودہ نسل کا انسان اپنے شباب میں اپنے آپ کو بھی جوان محسوس نہیں کر پاتا۔ اسے نہ تو حسنِ فطرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے اور نہ آغوشِ محبوب میں زندگی کی سختیوں اور تلخیوں سے پناہ ملتی ہے۔ وہ تارک الدنیا نہ ہونے کے باوجود ایک اذیت ناک تنہائی میں مبتلا رہا کرتا ہے۔ ایک بے نام سی افسردگی اسے کھائے جاتی ہے اور ایک مبہم سی خلش اس کی روح کو ناآسودہ رکھتی ہے۔ سرور نے موجودہ نسل کی زندگی کے ان سارے خدوخال کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی نظموں میں۔ "جب اور اب"۔ "بیزاری" "خلش" "اندھیرا اور اُجالا" "کل اور آج" خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہیں۔ لیکن ان نظموں میں شاعر نے موجودہ انسان کی زندگی کے صرف منفی رخ کو پیش نہیں کیا بلکہ اس کے مثبت پہلوؤں کی طرف بھی اشارے کئے ہیں۔ مثلاً ؎

شانوں پہ اپنے ہم جو اُٹھائے ہوئے ہیں بار
اس بار سے جھکے ہوئے ہیں ناتواں نہیں
وہ سرد پرسکون زمانہ گزر گیا،
انسانیت کی چیخ ہے اپنی فغاں نہیں
لیکن نئی بہار میں اپنا لہو بھی ہے
ہم عرصۂ حیات پہ بارِ گراں نہیں
کچھ کھو رہے ہیں زیست میں کچھ پا رہے ہیں ہم
انصاف کیجئے تو یہ سودا گراں نہیں (جب اور اب)

کرنیں پامال بھی ہو جائیں تو برباد نہیں
نقش مٹ مٹ کے سنورتا نظر آتا ہے مجھے
آج ویران ہیں کتنے ہی گلستاں پھر بھی
دشت میں پھول کھلانا بھی آتا ہے مجھے
جانتا ہوں کہ بڑا سخت گنہگار ہوں میں
اس اندھیرے میں اُجالے کا پرستار ہوں میں (اندھیرا اور اُجالا)

وادیوں میں سرد پھول چنیں کس کے لئے
ہم ہمالہ کی بلندی کے طلبگار رہیں آج
کرنیں خورشید کی کل اپنے قدم چومیں گی
کیا اندھیرے سے یونہیں برسرِ پیکار رہیں آج (کل اور آج)

یہ اور اس قسم کے دوسرے اشعار سے ظاہر ہے کہ سرور انسانیت کی بقا اور انسان کے ارتقا سے نہ خود مایوس ہیں اور نہ دوسروں کو مایوس ہونے دینا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ رجائیت ان کے صالح اور صحت مند شعور تہذیب و تمدن کی تاریخ کے مطالعہ اور انسان کی تعمیری قوتوں پر یقین و اعتماد کی آئینہ دار ہے۔

سرور کی شاعری جدید انسان کی ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی زیادہ جدید ہندوستان کی ترجمان ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام کو "وادیٔ گنگ و جمن" کے نام معنون کیا ہے۔ جدید ہندوستان سے میری مراد تقسیم کے بعد کے ہندوستان سے ہے، یوں تو "ذوقِ جنوں" ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۵ء تک کے کلام پر مشتمل ہے لیکن اس کی زیادہ تر نظمیں اور غزلیں ۱۹۴۶ء کے بعد کی ہیں ان نظموں اور غزلوں میں ہندوستان کی سیاست، حکومت، معاشرت

مذہب، تعلیم اور تہذیب سے متعلق وہ تمام رجحانات اور مسایل آگئے ہیں جو آج ہر ہوش مند اور حساس ہندوستانی کے سینے کا زخم بنے ہوئے ہیں برطانوی ہندوستان کے باشندے جن توقعات کے ساتھ آزادی کے منتظر تھے آزادی ملنے پر وہ توقعات مایوسیوں میں تبدیل ہوکر رہ گئیں۔ اسی لئے یہ آزادی بڑے شبہ کی نظر سے دیکھی گئی اور لوگوں کو اس بہار پر خزاں کا گمان ہوتا رہا۔ سرور کے یہاں بھی آزادی کی طرف یہی اندازِ نظر ملتا ہے ؎

لہک لہک کے چلی بادِ صبح آزادی — خزاں کا راج مگر پھر بھی اس چمن میں رہا
سیاہی ایک گئی اور دوسری آئی — کوئی نہ کوئی اندھیرا ہی انجمن میں رہا
دھواں دھواں ہوئیں شمعیں رہے تو داغ رہے — خزاں کا رقص بہاروں کی انجمن میں رہا

ان اشعار میں نام نہاد آزادی کا ماتم ہی نہیں بلکہ آگ اور خون کے اس سیلاب کی طرف اشارہ بھی ہے جو اسی "بادِ صبا" (یعنی آزادی) کا ہمراہ تھا۔ سنگدلی اور شقاوت، بربریت اور بہیمیت کے اس طوفان نے کچھ عرصہ کے لئے زندگی، انسانیت اور تہذیب کی شمعیں بجھا دیں اور لوگوں کے دلوں کو داغ دار کر دیا — دلوں ہی کو نہیں بلکہ ہندوستان کی تاریخ کو بھی۔ اس زمانہ میں ایک سوال یہ پیدا ہوا کہ اس بربادی اور پامالی کا اصل ذمہ دار کون ہے۔ "ترقی پسندوں" نے فتنہ و فساد اور کشت و خون کی ساری ذمہ داری سامراجی قوتوں کے سر منڈھ دی۔ لیکن یہ توجیہ سب لوگوں کو مطمئن نہ کر سکی۔ جب خواجہ احمد عباس نے کہا کہ اس قتل و غارت گری میں ہماری اپنی وحشت کو بھی کچھ کم دخل نہیں تو وہ ترقی پسندوں کے حلقہ میں بہت معتوب ہوئے اور رجعت پسند قرار دیئے گئے۔ اس کے بعد کسی ترقی پسند کو خواجہ احمد عباس کی رائے سے اتفاق کرنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ سرور ترقی پسند ہونے کے باوجود حقیقتوں کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھنے کی تاب رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھیں اس بات کا اعتراف ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ہمیں جس وحشت اور درندگی کا سامنا کرنا پڑا اس کی ذمہ داری صرف اغیار پر نہیں بلکہ اپنوں پر بھی ہے ؎

اپنے نگارخانہ میں مستوں نے کیا کیا — دُنیا پہ کیسے فاش کریں گھر کی بات ہے
بربادیٔ چمن میں ہمارا بھی ہاتھ ہے، — اس راز سے بتاؤ کسے آشنا کریں

"بربادیٔ چمن" میں اپنوں کے ہاتھ کو دیکھتے تو "ترقی پسند" بھی ہیں۔ مگر وہ اپنوں کے ہاتھ کو صرف آلۂ کار سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اس آلۂ کار سے کام لینے والے اغیار تھے۔ اس لئے فتنہ و فساد کی ساری ذمہ داری اغیار ہی پر عاید ہوتی ہے۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی ہزاروں منزلیں طے کر لینے کے باوجود انسان ابھی تک پورے طور پر انسان نہیں بنا ہے۔ اس میں وحشت اور بربریت کے جراثیم آج بھی موجود ہیں جو ذرا سا بھی اشتعال پاکر انسانوں کو ڈس لیتے ہیں۔ ان جراثیم کو اشتعال دینے والے کے جرم سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جب تک وہ جراثیم انسان کے اندر موجود ہیں انسان کو بھی معصوم نہیں مانا جا سکتا۔ سرور کی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کو معصوم ماننے یا منوانے پر مصر نہیں ہے ؎

تخریب میں تعمیر ہے، تعمیر میں تخریب — انساں ہے کوئی پیکرِ معصوم نہیں ہے

لیکن انسان کی خوابیدہ حیوانیت کو تسلیم کرنے کے معنی اسے حیوان محض ماننے کے نہیں ہیں۔ اور نہ اس حیوانیت کے ہنگامی غلبے کی بنا پر انسانی ارتقا سے انکار کرنا کوئی معنی رکھتا ہے۔ سرور نے صحیح کہا ہے کہ ؎

رفتارِ زمانہ خط معکوس نہیں ہے — بیدار ہے جو ذہن وہ مایوس نہیں ہے

اسی نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے کہ سرور نے فتنہ و فساد کے تاریک ترین دور میں بھی نہ صرف اپنے آپ کو بدحواسی اور بیزاری سے بچا لیا بلکہ دوسروں میں بھی زندگی، انسانیت اور تہذیب کے امٹ ہونے کا یقین بیدار کرتے رہے۔ ان کے اندر یہ اعتماد

بھی کارفرما ہے کہ جس طرح کل کے شیطان آج انسان بن چکے ہیں اسی طرح آج کے شیطان کل ضرور انسان بن جائیں گے۔ تعصب اور تنگ نظری کا دور دورہ ہمیشہ قایم رہنے والا نہیں ؎

زندگی ہے تو دلوں میں وسعتیں بھی آئیں گی　　اے سرور اپنے وطن میں آج آسایش تو ہے

آزادی ملنے کے بعد کے ہندوستان کی تاریخ صرف انسانوں کی حیوانیت اور رہبروں کی رہزنی کی تاریخ نہیں بلکہ اور بھی کئی رجحانات کی تاریخ ہے۔ ان رجحانات کی نمایندگی کے اعتبار سے سرور کی نظموں میں "برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے" "آہ بیچاروں کے اعصاب پہ ہندی ہے سوار" اور "سعی وفا" خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ "برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے" میں ہندوستان کو ترقی اور رجعت، محبت اور نفرت، تعصب اور رواداری، پرانے اصولوں اور نئے تقاضوں کے دوراہے پر دکھایا گیا ہے اس لحاظ سے یہ نظم جدید ہندوستان کا نہ صرف اچھا تجزیہ ہے بلکہ اس کی سچی تصویر بھی۔ چونکہ یہ نظم مختصر ہے اس لئے اسے یہاں تمام و کمال نقل کرنا بے جا نہ ہوگا۔

وہ خود ہی توڑتے ہیں رشتۂ محبت کو　　یہ چاہتے ہیں مگر جذب باہمی بھی رہے
جبیں پہ گرد کدورت نظر میں نشتر ہوں　　دلوں میں امن و اخوت کی چاندنی بھی رہے
پرانے گیتوں کی آواز تا فلک جائے　　نئے ترانوں کی لیکن ہماہمی بھی رہے
حقیقتیں جو بہت تلخ ہیں تو کیا غم ہے　　نگاہ لطف کی ہلکی سی چاشنی بھی رہے
خود اپنے قتل پہ راضی نہ ہوں جو دیوانے　　ستم کے ساتھ کچھ افسونِ دلبری بھی رہے
یہ جان و دل سے ہو جمہوریت کی شیدائی　　اقلیت میں کچھ احساسِ کمتری بھی رہے
شریکِ بزم ہوں سب جام چند تک پہونچے　　برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے
کچھ اور سخت ہوں عہدِ عتیق کے بندھن　　نئے زمانہ سے پونھیں سی دوستی بھی رہے
سیاہ رات کی زلفیں سنوارنے والے　　یہ کہہ رہے ہیں کہ ہاں دن کی روشنی بھی رہے
ہیں بادلوں کی ستاروں سے شوخیاں کیا کیا　　کہ ساتھ نور کے ظلمت کی ساحری بھی رہے

"آہ بیچاروں کے اعصاب پہ ہندی ہے سوار" ہندی کے ان حامیوں پر طنز ہے جو سرور کے الفاظ میں "ہندوستان کی دوسری اہم زبانوں کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہیں اور "ہندی، ہندو اور ہندوستان" کا نعرہ لگاتے ہیں"۔ ہندی، ہندو، ہندوستان کا نعرہ ایک غلط اور مضر رجحان سہی لیکن جدید ہندوستان کا ایک ایسا رجحان ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سچ پوچھئے تو یہ ایک قسم کا مرکب رجحان ہے۔ یعنی اس رجحان کے پیچھے اور کئی رجحانات کارفرما ہیں۔ اس رجحان میں غیر صحت مند ماضی پرستی، زمانے کی رفتار سے بے نیازی، انسانیت کے نئے مطالبات سے انحراف، ہندوستان کی صد رنگ تہذیب کو اپنانے سے انکار، ایک بلند مطمح نظر سے محرومی، مذہب اور وطن کا محدود تصور ان تمام چیزوں کو دخل ہے۔ اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

دشت و کہسار میں کب ان کو مجال تگ و تاز　　اپنے ہی صحن میں دوڑاتے ہیں اپنے رہوار
نہ کسی طور کی حسرت نہ ستاروں کی امنگ　　ان کی پرواز کو کافی ہے چمن کی دیوار
دورِ حاضر میں وہی عہد کہن کی باتیں،　　نئے میدان میں لائے ہیں پرانی تلوار
کس قدر چاؤ سے یہ دل میں بٹھا لیتے ہیں　　وقت کی گرد کے دھندلائے ہوئے نقش و نگار
فکر روشن ہے نہ پر سوز خلش ہے کوئی　　چمنِ شعر میں لائے ہیں لغت کے انبار
مل کے پینے کے انھیں کون سکھائے انداز　　سب کے حصے کی چڑھا جائیں یہی ہے اصرار

روح آدم میں تلاطم ہے نئے طوفاں کا — یہ مناتے ہیں ابھی ریت پہ بیٹھے تیوہار
ہند کے جلوۂ صد رنگ سے یہ نفرت ہے — ان کی محفل میں نہیں قوس قزح کے اذکار
عصرِ نو کا وہ جلو خانہ سجائیں کیونکر — محو رکھتے ہیں جنھیں اب بھی شکستہ آثار
مرحبا حسن سماعت کہ گراں ہوتے ہیں — میر و غالب کے سبک نرم رسیلے اشعار
اپنے ہی دیس کے لیکھک ہیں کہیں کیا ان کو — آہ بیچاروں کے اعصاب پہ ہندی ہے سوار

"سعی وفا" کا موضوع وہ مسئلہ ہے جس سے آزادی ملنے کے بعد ہندوستان کی سب سے اقلیت یعنی مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑا۔ وہ مسئلہ ریاستی وفاداری کا تھا۔ مسلمانوں کی وفاداری شبہ کی نظر سے دیکھی جا رہی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے ذہن میں اس قسم کے خیالات راہ پانے لگے کہ ؎

حرم کے کارنامے دیر میں مقبول کیا ہوں گے — بتوں کے سامنے ذکرِ خدا کرنے سے کیا حاصل
سمجھ کر گرد رہ وہ جھاڑ دیں گے اپنے دامن سے — دل و جاں ان کے قدموں پر فدا کرنے سے کیا حاصل
جہاں نفرت کی آندھی ہو تعصب کی ہوائیں ہوں — اک ایسے دشت میں خیمہ بپا کرنے سے کیا حاصل

لیکن یہ نظم ہندوستانی مسلمانوں کے صرف سیاسی اضطراب کی آئینہ دار نہیں بلکہ اس میں زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کی چمن بندی میں ان کا جو حصہ رہا ہے وہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور آج بھی وہ اس باغ کو سینچنے میں جو خونِ جگر صرف کر رہے ہیں وہ رائگاں نہیں جا سکتا ؎

یہ اوچھے باغباں گو سیرۂ بیگانہ ٹھہرائیں — عروسِ وادیِ گنگ و جمن کچھ اور کہتی ہے
بہاریں میری صدیوں کی چمن بندی کا حاصل ہیں — لبِ تاریخ کو میرے فسانے یاد ہیں اب بھی
یہ صدیوں کی حنا بندی کبھی تو رنگ لائے گی — بہاروں میں مری سعی وفا بھی جگمگائے گی

سرور کی شاعری میں جدید ہندوستان کی ترجمانی ہی نہیں ملتی بلکہ ان قدروں کا واضح تصور بھی ملتا ہے جن پر وہ جدید ہندوستان کی بنیادوں کو استوار دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس عقیدہ کا کھلم کھلا اظہار کر دیا ہے کہ موجودہ نظام زندگی کی قبا اس حد تک بوسیدہ ہو چکی ہے کہ یہاں وہاں رفو کر لینے سے کام نہیں چل سکتا۔ اب اس قبا کو بالکل اتار پھینکنے کی ضرورت ہے جب تک معاشرے کی از سر نو تنظیم نہ ہوگی، جب تک آزادی، سیاست اور حکومت کے محدود اور ناقص تصورات نہ بدلیں گے، جب تک قومیت بین الاقوامیت کے سرحدوں کو نہ چھولے گی، جب تک انسانیت شیخ و برہمن کی کشمکش سے بالاتر نہ ہوگی، جب تک عوام کو ان کے حقوق نہ ملیں گے، جب تک لوگوں کی اقتصادی ضروریات کی فراہمی کا مناسب انتظام نہ ہوگا، جب تک علم و فن کی برکتیں عام نہ ہوں گی جب تک لوگوں کو ماضی پرستی کی بجائے ماضی شناسی نہ آئے گی، جب تک ملک کے جوانوں میں علم کی سچی تشنگی نہ پیدا ہوگی، جب تک انھیں ہندوستانی تہذیب کے جلوۂ صد رنگ کا احساس نہ ہوگا، جب تک شعر و ادب کے جدید میلانات کے ساتھ ساتھ قدیم روایات کا شعور نہ پیدا ہوگا، جب تک ذہنی توازن، بے تعصبی، رواداری، امن پسندی، اخوت، انسانیت اور تہذیب لوگوں کی افتادِ طبیعت کے اجزائے ترکیبی نہ بن جائیں گے اس وقت تک جدید ہندوستان صحیح معنی میں جدید ہندوستان نہ بن سکے گا — تو یہ ہے سرور کے ذہن میں جدید ہندوستان کا تصور جو ان کی نظموں اور غزلوں میں نمایاں ہے۔ اس تصور کے مستحسن اور مبارک ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے لیکن میرے نزدیک اس باب میں جو بات سب سے زیادہ مستحسن اور مبارک ہے وہ یہ ہے کہ سرور نے جدید ہندوستان کا تصور پیش کرتے ہوئے چند قدروں پر اصرار کیا ہے، کسی مخصوص نظام زندگی پر نہیں میرا خیال ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کو انسانیت کی نجات انسانی قدروں میں تلاش کرنا چاہئے، کسی مخصوص سیاسی اور

اقتصادی نظام میں نہیں۔ اس لئے کہ اچھے سے اچھا سیاسی یا اقتصادی نظام ایک نہ ایک دن زوال پذیر ہو جاتا ہے مگر انسانی فلاح و بہبود کے وسیع تصور پر مبنی ہیں۔

میں نے اس مضمون کے شروع میں کہا ہے کہ سرور کی شاعری رومان سے حقیقت کی طرف یا غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی طرف ارتقا نہیں بلکہ ان دونوں عناصر کا امتزاج ہے۔ خود سرور کا بھی دعویٰ ہے کہ ان کے اشعار دہر کے کرب کا آئینہ بھی ہیں اور نگہ ناز کا عکس بھی۔ لیکن یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ سرور کی شاعری میں نگہ ناز کا عکس نسبتاً بہت کم ہے — اتنا کم کہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ انھوں نے رومانی یا عشقیہ شاعری کی ہی نہیں تو غلط نہ ہوگا۔ سرور حقیقت کے پرستار ہونے کے باوجود خواب سے بیزار نہیں۔ انھوں نے اس خیال کو مختلف پیرایوں میں دہرایا ہے کہ خوابوں سے توسیع حقایق میں مدد ملتی ہے۔ مگر اسکے باوجود وہ خوابوں کی دنیا میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ وہ حقایق کو رومان کے سنہرے غلاف پیش کرنے کے قایل نہیں۔ چنانچہ ان کے یہاں کبھی رومانی نظم نہیں ملتی۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے وہاں بھی انھوں نے حیات و کائنات کی ترجمانی میں فراق کی بجائے اقبال کے طریقِ اظہار کو ترجیح دی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے یہاں حسن و عشق کی شاعری بالکل نہیں ملتی۔ یہ ضرور ہے کہ سرور حسن و عشق کی دنیا سے بہت سرسری گزر گئے ہیں۔ وہ حسن کے پرستار کم اور ادا شناس زیادہ ہیں۔ ان کی شاعری میں غرورِ حسن اور غیرتِ عشق کی کشمکش کا اظہار کئی جگہ ملتا ہے لیکن جسم کی آنچ کہیں نہیں ملتی۔ ان کے یہاں اگر درد محرومی نہیں ہے تو احساس سرشاری بھی نہیں ہے۔ انھیں نہ تو عشق کے طوفان و سکون کا تجربہ ہے اور نہ عشق کے غم و مسرت کا عرفان۔ اسی لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے یہاں حسن و عشق سے متعلق اشعار تو ملتے ہیں لیکن عشقیہ شاعری نہیں ملتی۔ واقعہ یہ ہے کہ حسن و عشق سرور کی غزلوں کا بنیادی موضوع ہیں بھی نہیں۔ ان کی غزلوں میں وہ افکار و خیالات زیادہ ہیں جن کا تعلق زندگی کے اجتماعی پہلوؤں سے ہے۔ اگرچہ ان کی غزلوں میں کئی جگہ نظمیت پیدا ہوگئی ہے تاہم اچھے اشعار خاصی تعداد میں ملجاتے ہیں۔ چند اشعار دیکھتے چلئے:۔

کبھی ایسا بھی محبت میں جنوں ہوتا ہے
نگہ لطف سے درد اور فزوں ہوتا ہے

کیجئے کیا ایسے گرفتارِ محبت کا علاج
نہ سکوں ہوتا ہے جس کو نہ جنوں ہوتا ہے

لطف کا تیرے ملا ہے وہ سہارا ہم کو
اب تو ہر درد ہے کچھ اور گوارا ہم کو

یک گونہ ربط پنہاں اس میں بھی ہیں نمایاں
تم گرچہ کہہ رہے ہو باتیں اِدھر اُدھر کی

کم ہو متاعِ جاں بھی جس کی نظر کی قیمت
کس طرح اس کو چاہے ہستی ہی کیا بشر کی

آرزو نے بن میں بھی کیا کیا بسائیں بستیاں
بے دلی نے بستیوں کو بھی اُجاڑ بن کیا

جب بات نہ پوچھی تری بیگانہ نظر نے
یوں مٹ گئے دنیا کے بھی کام آ نہ سکے ہم

کسی نگاہ کا دل نے فریب کھایا تھا
یہ واردات بھی کیا یادگار گزری ہے

جی کا جنجال رہا زلفِ مسلسل کا خیال
کس خرابی سے ہر اک شب کو سحر ہم نے کیا

تیرے دل میں نہ جگہ پائی تو پھر کیا حاصل
اک زمانے کی نگاہوں میں جو گھر ہم نے کیا

غرورِ حسن سے وہ بے نیازی اب نہیں نبھتی
ٹھہر اے جذبِ الفت کس قدر نازک مقام آیا

چھاؤں میں زلفوں کی بھی ملجائے گا اک دن قرار
یہ بھی کیا کم ہے کہ ان کے دل میں گنجایش تو ہے

تمہارا عشق جسے خاک میں ملاتا ہے
اسی کی خاک سے پھر پھول بھی کھلاتا ہے

ہر تمنا کو وہ اک زخم بنا دیتے ہیں
ہم ہر اک زخم سے سو پھول کھلا دیتے ہیں

آج دیں داروں میں مذکور ہمارا کیا تھا
یہ فسانہ نہ کہیں گوشِ صنم تک پہونچے

رہِ حیات بڑے پیچ و خم سے گزری ہے
کسی طرف کوئی سیدھا سا راستہ نہ گیا

کہیں بوسیدہ قبا میں بھی رفو ہوتا ہے
جو بھی ٹانکا ہے اُدھر جائے تو پھر کیا کیجئے

خوابوں سے یوں تو روز بہلتے رہے ہیں ہم
کتنی حقیقتوں کو بدلتے رہے ہیں ہم

کس سے بارِ حیات اُٹھا ہے
کیا ہوا ہم اگر سنبھل نہ سکے

خوابوں کی یہ خلش تو بڑا کام کر گئی
سادہ حقیقتوں میں بھی کچھ رنگ بھر گئی

کوہ کن ان میں بھی کرتا ہے تعلق پیدا
جوئے شیر اور سہی سنگِ گراں اور سہی

جو قدم پھونک پھونک دھرتے تھے
ایسے بہکے کہ پھر سنبھل نہ سکے

لگاؤ لاکھ سہی پر لگن نہیں ملتی
ہوس تو عام ہے تہذیبِ عاشقی کم ہے

تجھ سے طوفاں کے تقاضے کبھی اتنے تو نہ تھے
تیری دلداریٔ ساحل کبھی ایسی تو نہ تھی

اپنے ہی گھر کی خیر منائی تمام عمر
ہم سے سرورِ فکرِ دو عالم نہ ہو سکی

ترقی پسند شاعروں میں سردار جعفری کے بعد اقبال کا گہرا اثر سرور کے یہاں نظر آتا ہے یہ اثر کہیں ان کی فکر میں جلوہ گر ہے کہیں ان کے فن میں - کہیں اسلوب میں - کہیں آہنگ میں - سرور کے مجموعۂ کلام کا نام تک اقبال کے اثر کا غماز ہے - اقبال کی طرح ان کے یہاں بھی لفظ "جنون" جدوجہد اور حوصلے کی علامت ہے - ان کی شاعری میں ذوقِ جنوں، ذوقِ یقیں، ذوقِ سفر، خونِ جگر، مشکل پسندی، آرزو پرستی، گریۂ سحری، آہِ نیم شبی، متاعِ قلب و نظر، قدیم و جدید کے تسلسل اور خودی و بیخودی کے امتزاج پر جو اصرار ہے اور عشرتِ پرویز پر عزمِ کوہ کنی کو، عقل کے جذبۂ خود کام پر عشق کی دولتِ بیدار کو، ہوش و خرد پر جذب و جنوں کو، عشرتِ ساحل پر لذتِ طوفاں کو، زینتِ شبستاں پر محشرِ نیستاں کو، منزل پر سفر کو اور اندیشۂ چالاک پر خونِ جگر کو جو ترجیح حاصل ہے وہ اقبال کے فیضان کا نتیجہ ہے شاعری میں سرور کا اسلوب تنقید اور اندازِ تلقین تک اقبال کے اسلوبِ تنقید اور اندازِ تلقین سے مشابہ ہے - سرور کے نظریۂ حیات پر بھی اقبال کی چھاپ موجود ہے - اقبال کی طرح ان کے نزدیک بھی زندگی کشمکش سے عبارت ہے - اقبال کا اثر سرور کے متفرق اشعار ہی میں نہیں بلکہ بعض نظموں اور کئی غزلوں میں شروع سے آخر تک نمایاں ہے - اقبال کے نقشِ قدم پر چلنے کے معنی فکر و فن کی صحت مند اقدار اور صالح روایات کو اپنانے کے ہیں - لیکن اقبال کی زبان، آواز اور لب و لہجہ میں بولنے کی کوشش اپنی انفرادیت کے حق میں کیا معنی رکھتی ہے اس بات پر ضرور نظر رکھنی چاہئے - خصوصاً اس لئے کہ انفرادیت کی تعمیر و تحفظ کے سلسلے میں خود اقبال یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ :-

مثل آئینہ مشو محوِ جمالِ دگراں
از دل و دیدہ فروشوئے خیالِ دگراں

اُردو شاعری کے مستقبل کو غزل کی بجائے نظم سے وابستہ ماننے کے باوجود سرور نے نظمیں کم کہی ہیں اور غزلیں زیادہ - میرے نزدیک ان کی نظموں میں "جب اور اب" - "خلش" - "اندھیرا اور اجالا" - "کل اور آج" - "جنت، شیطان اور آدم" - "برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے" - "نئے علی گڑھ سے خطاب" - "مقبروں میں ابھی بیٹھے ہیں مجاور کتنے" - "پیرِ مغاں کی یاد میں" "سعیِ وفا" - "دیوالی" - "ایک قنوطی دوست سے" - "لیلائے شعر اور نگارِ زیست" - "آہِ بے چاروں کے اعصاب پہ مہندی ہے سوار" "کافی ہاؤس" - "نئے انسان کا نغمہ" - "ماتم کیوں" - "سکوت یا موت" - "کیسے" - "کسی کی آپ بیتی" - "زخموں کی کائنات" - "روداد اسیری" اور "شام اودھ" - اہم نظمیں ہیں - ان میں فنی اعتبار سے مجھے "سعیِ وفا" اور "برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے" سب سے زیادہ پسند آئیں - آخر الذکر نظم میں شاعر کی اخلاقی جرأت، صاف گوئی اور تلخ نوائی نے مجھے خصوصیت کے ساتھ متاثر کیا

سرور اپنی نظموں میں مسلسل خیالات پیش کرنے کی بہ نسبت بلیغ اشاروں اور لطیف کنایوں سے زیادہ کام لیتے ہیں جس کی بنا پر ان کی نظموں میں جا بجا تغزل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جہاں غزلوں میں نظم کی کیفیت کا پیدا ہو جانا غزلوں کا بڑا عیب ہے وہاں نظموں میں تغزل کی کیفیت کا پیدا ہو جانا نظموں کا بڑا حسن ہے۔ میرا خیال ہے کہ فنی اعتبار سے "سعی وفا" سرور کی سب سے خوبصورت اور کامیاب نظم ہے۔ جیسا کہ سرور نے خود لکھا ہے وہ شاعری میں کلاسیکل طرز کے زیادہ دلدادہ ہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے ایک نظم معرا اور دو آزاد نظمیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان نظموں میں وہ ابہام نہیں جو میراجی اور ان کے گروہ کے دوسرے شاعروں کی مشترکہ خصوصیت ہے۔ دراصل یہ فرق سرور اور میراجی کا نہیں بلکہ ترقی پسند شاعروں اور میراجی کے قبیلے کا فرق ہے۔ سردار جعفری اور دوسرے ترقی پسند شاعروں کی بھی، معرا اور آزاد نظموں میں ابہام اور دور از کار اشاریت سے شعوری گریز ملتا ہے۔ کیونکہ ان کا خطاب عوام سے ہے۔ سرور کی نظموں میں کہیں کہیں تعمیری حسن کی کمی کھٹکتی ہے۔ بعض اوقات وہ جوش کی طرح ایک بات ایک مرتبہ کہکر مطمئن نہیں ہوتے اور اسے غیر ضروری طور پر دہرا دیتے ہیں۔ یہاں جوش کا نام لینے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ان کے یہاں یہ خامی جوش کے اثر کا نتیجہ ہے۔ ویسے ان کے یہاں جوش کا تھوڑا اثر ضرور ہے۔ ان کی نظم "نئے انسان کا نغمہ" جوش کے انداز بیان کی یاد دلاتی ہے۔

سرور کی غزلوں میں جا بجا نظم کی کیفیت ضرور پیدا ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں خشکی اور بے کیفی نہیں پائی جاتی۔ انھوں نے غزل میں زندگی کے مسایل کو سمونے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن اس باب میں غزل کے آداب و روایات سے بغاوت ہرگز نہیں کی۔ ان کی غزلوں کی ایک بڑی خوبی ہمواری ہے اور یہ ہمواری اس لئے اور بھی قابلِ تعریف ہے کہ سرور کی زیادہ تر غزلیں مشکل زمینوں میں ہیں۔

سرور کا انداز بیان واضح شگفتہ اور دل آویز ہے۔ لیکن ابھی ان کے یہاں تلوار کی وہ تیزی نہیں آنے پائی جس پر وہ اپنے تنقیدی مضامین میں اصرار کرتے ہیں اور جسے وہ ہر شاعر کے یہاں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں فارسی الفاظ اور تراکیب کا عمل دخل زیادہ ہے جس سے ان کی شاعری میں بڑی خوش آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔ کہیں کہیں انھوں نے ہندی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ لیکن وہ الفاظ ان کی شاعری کی فضا سے ہم آہنگ نہیں۔ مثلاً :-

وطن میں اپنے چاہئے سرور شوق با شعور
نفس کی گو کمی نہیں مگر نظر کا کال ہے

یہاں لفظ کال کی وجہ سے کس قدر بے سرا پن پیدا ہو گیا ہے۔ سرور زبان پر خاصی قدرت رکھتے ہیں اور ان کے بیان میں بڑی روانی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے "ذوق جنوں" کے ابتدائی صفحات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ :- "میں عام طور پر صحت زبان کا خیال رکھتا ہوں اور ادبی مزاج کا قایل نہیں۔ لیکن کہیں کہیں لطافت کا تقاضا ہوتا ہے یا بات کہنی ضرور ہوتی ہے تو قواعد کے حصار کا اتنا خیال نہیں رکھتا۔" سرور کی شاعری ان کے اس بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا دامن ادبی مزاجیت کے داغوں سے یقیناً پاک ہے۔ ویسے ان کے یہاں بعض فنی اور معنوی کوتاہیاں ضرور ملتی ہیں۔ لیکن تھوڑی بہت لغزشوں سے کون بچا ہے۔ ان کی شاعری کی شگفتگی و شادابی، تازگی و ترنم سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ابھی اس میں وہ رچاؤ اور گھلاوٹ محسوس نہیں ہوتی جو شاعری کو ساحری بنا دیتی ہے۔

پھر بھی "ذوق جنوں" کے مطالعہ کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر سرور صرف تنقید نگاری پر اکتفا کریں تو بہتر۔ میرے خیال میں ابھی ان کے شاعرانہ امکانات کی تکمیل باقی ہے اور اس تکمیل سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

روایت و درایت

(وقار احمد رضوی)

روایت اور زندگی میں وہی نسبت ہے جو نکہت و گل میں۔ زندگی کی تعمیر کے لئے روایت کا وجود خود زندگی کی پائندگی سے عبارت ہوتا ہے۔ روایت۔ نظم حیات اور احساس زندگی کی ہمیشہ سے معاون رہی ہے۔ روایت نے ہمیشہ زندگی کا ساتھ دیا ہے۔ زندگی کی زلف پیچاں جب بھی برہم ہوئی ہے، جب بھی انسانیت نے بہمیت کی بندگی کی ہے اور جب بھی تمام عالم انسانیت، جبر و استبداد، درایت و ادراک کے مظالم سے نیم جان ہوئی ہے، انسانی زندگی کی تاریخ گواہ ہے کہ اس وقت روایت نے بھٹکی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کی ہے۔

روایت اور درایت کا کائناتی تصور ہمیشہ ایک دوسرے سے متصادم رہا ہے اور نتیجہ میں روایت ہی نے ہمیشہ درایت پر فتح پائی ہے۔ اس لئے کہ فطرتِ کونیہ کا واجبی نظام ہمیشہ اس بات کا متقاضی رہا ہے کہ روایت غالب رہے۔ ورنہ اگر اس کائنات پر کبھی بھی درایت پوری طرح حکمراں ہو جاتی تو آج یہ زمین و آسمان فرعون و نمرود کی تاجداری کا کلمہ پڑھتے نظر آتے۔ آج تک دنیا میں کتنے ہی نمرود پیدا ہوئے اور کتنی ہی بار انھوں نے درایت کے نام پر اس کائنات کی آقائی کو خریدنا چاہا۔ لیکن انسانی تاریخ میں کائنات کا کوئی بھی حصہ ایسا نظر نہیں آتا، جہاں برسوں صرف درایت نے حکمرانی کی ہو۔ یونان کی عقلی بیداری کا وہ دور جس میں سقراط اور ارسطو دنیا کو فلسفہ و حکمت، درایت و عقل کی تعلیم دے رہے تھے، روایت پسند "کلبی حکماء" کو بھی پیدا کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور آج بھی یورپ میں بظاہر چاروں طرف درایت کی اور رنگ نشینی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہاں کے عوام اور خواص کے ضمیر آج بھی عیسیٰ مسیح کی تعلیمات و نفحات کی آواز بازگشت آیا کرتی ہے۔ معبدوں کی گنبدیں آج بھی انجیل پاک کی صداؤں سے گونجا کرتی ہیں۔ گرجوں کے کلس آفتاب عبودیت کی ضیا پاشیوں سے آج بھی جگمگایا کرتے ہیں اور صلیبی مشیخت کی کلاہِ کج عقیدت کی بارگاہ میں آج بھی خم ہو جاتی ہے۔

فرعون کی فرعونیت، نمرود کی ہوسِ آقائی اور آذر کی خارا تراشی نے کتنے ہی ایسے شیش محل جنم دئے جن کے شیشے پاش پاش ہو گئے، روایت کی ضربِ خارائی سے اور فرعون کی بغاوت نے موسوی رحمت کی آغوش میں آسودگی اور آذر کی بت گری نے ابراہیم کی خارا گدازی سے لذتِ شکستگی پائی۔ نگارنو کی شیشہ جانی نے سنگ و خارا کے دلوں کو شگاف اندام بنا دیا اور باطل کی روحِ خاترسیدہ محض "شیشۂ دل" بن کے رہ گئی۔ شیشے ٹوٹنے لگے اور ساقی نے نگاہوں کے جام و سبو سنبھالے۔ اور پھر عرب کے ایک یتیم فرزندِ محترم کے ضمیر کو روایت نے اتنی زبردست قوت بخشی کہ اس کی ایک آواز نے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کو ہلا ڈالا۔ اور جب عرب کے حق پسندوں کا یہ گروہ روایت کی رہبری میں آگے کی طرف کوچ کر رہا تھا تو عجمی شان عنکبوتی روایت کے جاہ و جلال کے سامنے اپنی زندگی کا آخری سانس لے رہی تھی۔ براہمی کاروان، محمدی پیشوائی میں آہنی عزم کے ساتھ گام بہ گام اپنی منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھا رہا تھا اور نمرود و آذر کی خاک نشین عظمت، عرب کے ریگستانوں میں خاک آلود ہو رہی تھی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو دُنیا کے تمام مذاہب، آسمانی یا مذہبی کتابیں، رشیون، نبیوں اور پیغمبروں کا وجود صرف اسی ایک لفظ "روایت" کی تفسیر نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب روایت ہے اور روایت کا براہ راست تعلق انسانی ضمیر سے ہے اس کے برعکس درایت کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ اس لئے روایت دل ہے اور درایت عقل۔ دل مرکزِ جمال ہوتا ہے اور عقل مبدأ جلال۔ اور یہ مانی ہوئی چیز ہے کہ جلال کی بہ نسبت جمال ایک پائدار حقیقت ہے ایک حادث ہے تو دوسری ثابت حدوث و ثبوت کی اس جنگ میں ظاہر ہے جو کامیابی ایک ثابت حقیقت کو حاصل ہو سکتی وہ حقیقتِ حادثہ کو کہاں ؟۔ بابل و آرمینیا کی پرانی تہذیب کی موت، عرب بائدہ کی تباہی اس لئے واقع ہوئی کہ انھوں نے اپنی روایت کا تحفظ نہیں کیا اور ایک "حقیقت حادثہ" ہی کو حاصلِ زندگی سمجھ بیٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ "مذہب" نے انسانوں کے دلوں پر حکومت کرنا سکھایا۔ دنیا کی تاریخ میں کسی شہنشاہیت یا حکومت کی ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی جس نے انسانوں کے ضمیروں پر حکومت کی ہو۔ شاید اسی وجہ سے ان کی "عظمتیں" فنا کی گرفت میں آئے بغیر نہ رہ سکیں۔ قیصر و کسریٰ کا وہ جاہ و جلال اب باقی نہیں جس کے سامنے عرب و عجم کے سر جھک جاتے تھے۔ لیکن محمد کی تعلیمات کے ماننے والے کائنات کی اس عریض و بسیط سطح پر آج بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور یہ صرف اس لئے کہ محمد نے دماغ کے ساتھ ساتھ دل پر بھی حکومت کرنے کے طریقے سکھائے۔ اور فرقانِ مجید نے درایت کو ضمنی حیثیت دے کر روایت کو اپنانے کی تعلیم دی۔ تقریباً یہی حال دوسرے مذاہب کا بھی ہے۔ گوتم بدھ اور عیسیٰ مسیح اگرچہ آج دُنیا میں نہیں لیکن اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے والے باوجود عقل کی اس ترقی کے، آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔ اور یہی روایت کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

روایت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ کچھ لوگ اس کو بہت ہی محدود معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ روایت کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ کچھ پُرانے اصولوں کی عظمت تسلیم کرنے کے بعد ان کی اندھا دھند تقلید کی جائے۔ بلکہ روایت یا تقلید کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اسلاف کے تجرباتِ زندگی اور مشاہدات کی روشنی میں اپنی جدید ناآزمودہ کار حیاتِ ناتمام کے اوراقِ پریشاں کی ترتیب و تہذیب کی جائے تاکہ اس کے ذریعہ مصحفِ زیست کی صحیح ترتیب عمل میں آسکے اور دلِ صد آرزو پسند ضبطِ حیات اور جمعیت دل و سکونِ خاطر حاصل کر سکے۔ کیونکہ روایت فطرت ہے کہ وہ ضبطِ ملت و مذہب کرتی ہے۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جمعیت اسی کی بدولت آتی ہے۔ اس لئے کہ روایت نے ہمیشہ زندگی کو زندہ رہنے کے طریقے، ملت و مذہب کو ضبط و نظم کے اصول سکھائے ہیں ؎

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است
معنیِ تقلید ضبطِ ملت است

تقلید اور روایت تقریباً ایک ہی چیزیں ہیں۔ دورِ جدید میں تقلید کا مفہوم کچھ کریہہ سا ہو گیا ہے۔ مذہب و روحانیت، شریعت و طریقت کے ماننے والوں کو یہ نئی تہذیب کے دلدادہ بڑی بُری نگاہوں سے دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ یہ پُرانی روایات کے پرستار، پُرانی لکیر کے فقیر اور اپنے آبا و اجداد کے راستوں پر چلنے والے آج کے نئے ماحول کی تعمیر کیا کر سکتے ہیں۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو کہنے والے خود ایک حیثیت سے مقلد اور روایت پرست ہیں کیا مارکس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے والے مارکس کے مقلد نہیں ؟۔ کیا فرائڈ کے نظریۂ جنس کی پیروی کرنے والے روایت پرست اور رجعت پسند نہیں ؟ اگر مارکس کے نظریات کے ماننے والوں اور لینن و اسٹالن کی آواز پر لبیک کہنے والوں کو مقلد یا روایت پرست نہیں کہا جا سکتا۔ اگر وہ انفرادی نظریاتِ زندگی کی تقلید کرنے کے باوجود ترقی پسند مہذب اور خردمند تسلیم کئے جا سکتے ہیں تو مذہب کے ماننے والوں، محمدؐ یا کسی بھی مصلح انسان کے بتائے ہوئے اصولوں

پر چلنے والوں کو بھی مقلد کہکر ان کی پشت پر رجعت پسندی اور روایت پرستی کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا اس لئے کہ جس طرح مارکس کے ماننے والوں کو مارکس کے مذہب پر ایمان لانے کا حق حاصل ہے اسی طرح مذہب و شریعت کے پجاریوں کو بھی اپنے مذہب و دین کی صداقت و عظمت تسلیم کرنے کا حق حاصل ہے۔ روایت اس لئے محبوب ہے کہ اُس نے جب بھی انسانی زندگی کی عنان اپنے ہاتھ میں لی ہے اس نے دُنیا کو امن، صلح، روح اور شانتی کی تعلیم دی ہے اور روایت جب بھی برسر اقتدار آئی ہے اُس نے دُنیا سے سکون و اطمینان مختم کیا ہے۔ آج دُنیا اس لئے پریشان ہے کہ یہ عہد درایت پسندی کا دور ہے۔ آج کے دور میں عقل و دانش کی فراوانی ہے۔ انسانی ادراک و خرد اپنی انتہائی ارتقاء کی منزل پر پہونچ چکی ہے۔ آج انسان اپنے عقل کی طاقت کے بھروسے پر خود اپنی انسانی نسل کو کچلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آج صرف وہ ملک و قوم اور وہ جماعت زندہ رہ سکتی ہے، جس کے پاس ایٹم بم ہو، جس کے پاس ہائیڈروجن بم ہو یا سیم و زر سے بھرے ہوئے ایوان و قصرِ فلک بوس ہوں۔ اور یہی درایت یا عقل کے ارتقاء کی انتہائی پستی ہے۔ ایٹم کی تخلیق جہاں دُنیائے عقل و خرد کے لئے قابل صد تحسین ہے وہاں وہ درایت کے دامن پر ایک ایسا بدنما داغ ہے جس کو آسانی سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ درایت نے انسانی نسل کو نیست و نابود کرنے کے طریقے سکھائے ہیں۔ نسل آدم کے کشت و خون کے یہ حوصلے درندگی، حیوانیت یا بہیمیت تو کہے جا سکتے ہیں لیکن اس کو کسی بھی صورت سے انسانیت یا انسانی زندگی کی معراج نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج پھر یہ نیا انسان اب سے سینکڑوں برس پہلے انسانوں کی تعلیمات کی طرف اپنا رخ موڑ رہا ہے۔ آج پوری دُنیا امن کی پیاسی ہے سب ملک، سب قومیں، امن کی آواز کو بلند کر رہی ہیں اور یہ "امن" کا پیغام وہی ہے جو آج سے سینکڑوں برس پہلے خدا کے بھیجے ہوئے برگزیدہ بندوں نے روایت اور روح کے نام پر دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

اور اگر غور سے دیکھا جائے تو روایت فطرت کا تقاضا ہے۔ فطرت چاہتی ہے کہ کائنات کی ہر چیز روایت پرست ہو۔ یہ آسمان کے چاند، ستارے ہزاروں اور کروروں برس گزر جانے کے بعد آج بھی رات کی تاریکیوں میں خدا کی مخلوق پر نور کی بارش کرتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ فطرت آج تک ان کو روایت پرستی کی تعلیم دیتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کروڑوں برس گزر جانے کے بعد آج بھی ان کا جوہر قابل چمک رہا ہے ورنہ انسان کی طرح اگر انھوں نے بھی اپنی روایت سے بغاوت کی ہوتی تو شاید آج اس نادان انسان کی طرح یہ چاند، ستارے بھی اپنی عظمت کو کھو بیٹھتے۔

(نگار) جناب رضوی نے روایت و درایت کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اس حد تک تو یقیناً درست ہے کہ روایت کا انسانی زندگی پر بڑا اثر پڑتا ہے لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ روایات نے ہمیشہ تعمیری خدمت انجام دی ہے اور تخریب کا ان سے کوئی تعلق نہیں یا یہ کہ انسان درایت سے بالکل بے نیاز ہوکر انسان بنایا بن سکتا ہے، از روئے عقل و تاریخ دونوں طرح غلط ہے۔ خیر یہ تو ایک سنجیدہ بحث ہے اور رضوی صاحب کا مضمون غالباً اس بحث کا متقاضی نہیں۔ ایک کھلنڈرے پن کی بات ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اسے دیکھنا چاہئے، چنانچہ رضوی صاحب کا یہ مضمون پڑھکر عرفی کا یہ شعر بے اختیار میرے سامنے آگیا:۔

حد ذات تو بہ ادراک نہ شاید دانست
ایں سخن نیز بہ اندازۂ ادراک من ست

ادراک کی کمزوری عرفی بھی تسلیم کرتا ہے، لیکن لطف یہ ہے کہ اس کمزوری کا علم اسے ادراک ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے بالکل اسی طرح رضوی صاحب روایت کو درایت پر مرجح قرار دیتے ہیں لیکن استدلال و ثبوت میں وہ بھی درایت سے کام لیتے ہیں۔

منکر بے بودن و ہم رنگ ہستاں زیستن!

علی گڑھ کے دورِ اوّلیں کی ایک عجیب شخصیت

شاعر و ادیب محمد داؤد عباسی مرحوم بی۔ اے (علیگ)

(سبطِ محمود فاروقی)

۲۰ رمضان ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۹ فروری ۱۸۶۲ء میں قصبہ امروہہ ضلع مراد آباد (یوپی) کے ایک عباسی گھرانے میں ولادت ہوئی۔ ۲۱ نومبر ۱۸۷۵ء کو بعمر ۱۳ سال علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں جو اُس زمانہ میں نیا نیا قایم ہوا تھا۔ بغرض اکتساب علم داخل ہوئے۔ ۱۸۸۹ء میں ایف۔ اے اور ۱۸۹۱ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ ان کے خاص مضامین فلسفہ اور ادبیات فارسی تھے۔ دو سال تک علی گڑھ کالجیٹ اسکول میں ٹیچر رہے۔ پھر ۱۸۹۳ء سے سرکاری ملازمت میں منسلک ہو کر علی گڑھ سے باہر چند مقامات پر متعین رہے۔ تحصیلداری پر تقرر ہوا تھا کہ ۲۷ جون ۱۹۰۰ء کو تقریباً چالیس کی عمر میں بعارضہ تپ محرقہ بمقام فتح آباد ضلع آگرہ انتقال کیا۔

داؤد مرحوم کو شاعری اور سخن سرائی کا خاص ذوق موہبت الٰہی کے طور پر عطا ہوا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے جو داؤد مرحوم کے زمانہ میں علی گڑھ میں جونیئر طالب علم تھے ایک موقع پر لکھا تھا کہ:۔

"محمد داؤد مرحوم کو جو راقم الحروف کے زمانہ طالب علمی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ایک تلمیذ رشید تھے مبداء فیاض سے سخن سرائی کا ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا۔ شعر فی البدیہہ کہتے تھے اور ظرافت تو مرحوم کا خاص حصہ تھی، اتفاق ایسا ہوا کہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر (یوپی) سے جتنے لوگ علی گڑھ آئے سب کے سب امام شعرانی کی ضد واقع ہوئے تھے اور قدرت نے ان کے جسم کو تو نہیں لیکن سروں کو ضرور فکر مقراض سے فارغ البال کر رکھا تھا۔ اس پر مرحوم کو ذیل کی اچپلوتی سوجھ گئی جو اسی وقت کالج کے ہر بے فکرے کی زبان پر تھی ؎

آتا ہے کاندھلہ سے جو لاتا ہے سر پہ گنج "قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا؟"

صاحب "تذکرہ خندۂ گل" ان کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔ "قدیم و جدید دونوں رنگوں میں شعر کہتے تھے۔ طبیعت میں چونکہ شوخی کا مادہ زیادہ تھا اس لئے کہیں کہیں وہ ایک ہلکی سی ظرافت اختیار کر لیتا ہے۔"

شوخی طبیعت کے ساتھ وہ نہایت سنجیدہ اور متین، نیک نہاد و نیک صفات تھے۔ مدۃ العمر علی گڑھ میں رہے مگر اپنی وضع قطع میں تبدیلی نہیں کی۔ مولانا محمد علی مرحوم نے ۱۹۲۸ء میں داؤد مرحوم کے کلام پر جو تقریظ[1] لکھی تھی اس میں ان کی وضع قطع کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"۱۸۹۰ء کی گرمیوں میں جب میری عمر ساڑھے گیارہ برس کی تھی میں اپنے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ... علیگڈھ کے مدرسۃ العلوم

---

[1] مولانا محمد علی مرحوم نے یہ تقریظ اس وقت لکھی تھی جب وہ انگلستان کے سفر پر بغرض علاج جا رہے تھے اور پی اینڈ او کمپنی کے جہاز کی ڈیک پر بیٹھ کر تحریر کی تھی اور داؤد مرحوم کے چھوٹے بھائی محمود احمد صاحب عباسی کو بھیجی تھی جو اب تک ان کے پاس موجود ہے۔

میں پڑھنے آیا ..... اس "نیچر گڑھ" میں تقریباً سب ہی طلبہ کی ایک ہی سی وضع قطع تھی - شیروانی، اچکن، ترکی ٹوپی، ڈھیلا پاجامہ، قمیص، جُراب، یہی سب کا لباس تھا... لیکن ہمارے پاس والی بارک کے بیچ والے کمرے میں .... ایک دراز قامت مگر خاصے دُبلے پتلے صاحب رہا کرتے تھے جو خالص ہندوستانی پُرانی وضع کی اچکن پہنا کرتے تھے، جن کی ٹوپی ان کے وطن امروہہ کی ساخت کی کشتی نما ہوتی تھی جن کا جوتہ دہلی کا سلیم شاہی وضع کا مگر سادہ ہوتا تھا اور جن کے بال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لانبے تھے اور اگرچہ "بردوش" نہ سہی "تابنا گوش" ضرور آتے تھے تاکہ ان لانبے بالوں کے باعث اچکن پر تیل وغیرہ کا دھبہ نہ پڑ جائے وہ گردن میں سپید خاصے کا رومال اسی طرح ضرور باندھا کرتے تھے جس طرح سرسید علیہ الرحمۃ اپنے گلے کی رسولی کو چھپانے کے لئے استعمال فرمایا کرتے تھے - یہ وضع قطع اُس زمانے کے بزرگوں کی اُس وقت تک باقی تھی - لیکن علی گڑھ جیسے "نیچر گڑھ" کے کسی طالب علم کا اس وضع قطع کو برقرار رکھنا اُس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ نمایاں تھا جس طرح آج کسی یورپین لیڈی کا بڑے بال رکھنا، نیچا سایہ پہننا اور سینہ و گردن، بازوؤں اور باہوں کا ڈھانپنا نمایاں ہوگا۔ اس لئے میری نظر بھی آتے ہی ان بزرگ پر پڑی اور اگر اُنھیں کسی اور طرح کا امتیاز نہ بھی حاصل ہوتا تب بھی میں ضرور اپنے بھائیوں سے پوچھتا کہ یہ اس عجیب و غریب وضع قطع کے بزرگ کون ہیں - لیکن محمد داؤد صاحب کو کون نہیں جانتا تھا - علی گڑھ میں اُس وقت سب سے زیادہ ممتاز اور ہر دل عزیز جو جماعت تھی، اُس کے سردار یہی پُرانی وضع قطع کے بزرگ تھے۔ ان کے کمرے پر بیسیوں ممتاز ترین طلبہ کا مجمع رہا کرتا تھا"

مولانا حالی مرحوم کی مشہور غزل ہے ؎

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت — نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

مقطع ہے ؎

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں — دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

داؤد مرحوم نے مولانا کے مقطع کی جو تضمین کی ہے اُس کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم لکھتے ہیں :-

"باوجود پوری سنجیدگی کے داؤد مرحوم کی طبیعت نہایت شگفتہ تھی اور مولانا حالی کی ایک مشہور غزل کے مقطع پر جو تضمین اُنھوں نے لکھی تھی، اُس نے تو مولانا حالی تک کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل لے لیں، صرف میرا تخلص مقطع سے نکال ڈالیں تو میں خوش اور میرا خدا خوش، مگر تضمین بھی بلا کی تھی، ایک ہی مصرعہ نے مولانا مرحوم کے شعر کو ستیاناس کر دیا۔ سنئے ؎

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں — پہلے یہ دیکھے وہ اس کام کے ہے بھی شایاں
سُن کے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے داؤد کے ہاں — ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت"

اس کے بعد ان کا ایک اور لطیفہ مولانا مرحوم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

"کالج میں ایک عرصہ تک ہر "نسل" میں ایک طالب علم کو "بوم" کا لقب عطا ہوتا تھا - اس "نسل" کے "بوم" کو مولانا شبلی کی صحبت میں رہنے کا عشق تھا، جب کالج کا گروپ کھنچنے لگا تو "بوم" صاحب فوراً مولانا شبلی کی کرسی کے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے جب گروپ کھنچ کر آیا داؤد صاحب نے اسی وقت لکھدیا ؎

آج کالج میں مچ رہی ہے دھوم — طلبہ کا ہے ہر طرف سے ہجوم
بول اُٹھی روح سعدیٔ مرحوم — "کس نہ آید بزیر سایۂ بوم"
اِلّا مولانا شبلیٔ مخدوم"

داؤد مرحوم کے خاندان میں ایک معمر بزرگ علی حسین عباسی تھے، دمہ کے مریض، کھانسی کھنکار، بلغم، تھوک، ہر دم واسطہ

اپنے اکلوتے فرزند ابن حسن عباسی ڈپٹی کلکٹر کے پاس ان کے مقام تعیناتی پر ملنے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ لوگوں نے وفات کی تاریخیں کہیں، داؤد مرحوم اپنے ایک دوست مولانا طفیل احمد (علیگ) مرحوم کو خط مرقومہ ۲۰ رمضان میں لکھتے ہیں کہ "جو تاریخیں ہوئی ہیں وہ ان مرحوم کے حسبِ حال نہ تھیں، مجھ کو حسب حال لکھنی چاہئے، چنانچہ مادہ تاریخ ایسا ہی نکالا ہے۔ سنئے ؎

مر گئے ہیں بڑے میاں جب سے — دل میں اُٹھتی ہے اُن کے غم سے ہوک
تھے بڑے نیک بخت اور دیندار — کرتے رہتے تھے سب سے نیک سلوک
جنتی ہونے میں نہیں ان کے — دوست دشمن کسی کے دل میں شکوک
سب نے لکھی ہیں اُن کی تاریخیں — ہوگئی اک فقط مجھ ہی سے چوک
اس لئے آج میں نے بھی اپنی — شاعری کی گھڑی کو دی ہے کوک
جب سے دُھن ہوگئی ہے بھول گیا — کس کو کہتے ہیں پیاس کیسی بھوک[1]

[1] برعایت روزہ ماہِ مقدس

بولا ہاتف کہ ہو گئے بے گھر
آج کھانسی، کھنکار، بلغم، تھوک

۱۸۹۹ء

شعر گوئی ان کو ایک وہبی عطیہ تھا، نہ کسی سے تلمذ حاصل تھا اور نہ کسی سے کبھی اصلاح لی۔ بایں ہمہ مختلف اصناف میں بتقاضائے طبیعت طبع آزمائی کی ہے۔ ایک مثنوی لکھی تھی جس کے بارے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم لکھتے ہیں:۔

شعر نے جس شخص کے لئے (یعنی خود اُن کے اپنے لئے) اتنی کم عمر میں بقول غالب خود خواہش کی ہو کہ "گردد فنِ او" وہ بھلا داؤد صاحب پر کس طرح عاشق نہ ہوتا جبکہ اسے اسی زمانہ میں معلوم ہوگیا تھا کہ داؤد صاحب کا بھی یہی فن تھا۔ میں نے سنا تھا کہ چودھری ممتاز[1] حسین صاحب کو آج کل کے کلکٹر سید زین[2] الدین صاحب کے ساتھ خاص اُلفت تھی مگر سید زین الدین صاحب جس طرح ۱۹۲۱ء[3] میں نان کوآپریٹروں پر ظلم کرنے میں مشہور تھے اسی طرح اس زمانہ میں چودھری صاحب پر یہاں تک ظلم فرمایا کرتے تھے کہ بچارے چودھری صاحب نے خودکشی کی ٹھان لی تھی۔ اس قصہ کو داؤد صاحب نے ایک مثنوی کی شکل میں منظوم کیا تھا اور ۱۸۹۰ء سے مجھے اس کا ایک شعر یاد ہے جس میں سید زین الدین صاحب کا اپنی کوٹھی سے یہ سنتے ہی گھبرا کر باہر نکل آنا بیان کیا گیا ہے ؎

نہ ہوا سر دھتی نہ سر پہ چھاؤں — اس پہ طرہ یہ تھا کہ ننگے پاؤں

"اس مثنوی کو ہمیں بھلا کون کیوں دکھاتا لیکن کسی نہ کسی کی زبانی میں نے یہ شعر سن لیا تھا اور گوزیابیطس کے باعث حافظہ اب بالکل برباد ہوگیا ہے لیکن الحمدللہ بچپن کے سنے سنائے شعر اب تک یاد ہیں۔ جب میرے عزیز دوست محمود احمد عباسی نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اس مثنوی کو وہ پھر شایع کریں گے اور تقریظ لکھنے کی مجھ سے فرمائش کرکے مجھے وہ مثنوی دکھائی تو میں نے سب سے پہلے اسی شعر کی تلاش کی اور عجیب مسرت ہوئی جب اس کو اسی طرح مثنوی میں اسی موقع پر جس کا میں نے اپنے حافظہ سے ذکر کیا ہے، پایا۔"

---

[1] پانی پت ضلع کرنال کے رہنے والے تھے ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ سے ایف۔ اے کرکے نائب تحصیلدار بنے پھر تحصیلدار ہوکر ریٹائر ہوئے۔ عرصہ ہوا انتقال کیا۔ [2] علیگ سے ایم۔ اے کی سند حاصل کرنے کے بعد براہِ راست ڈپٹی کلکٹری پر تقرر ہوا، پھر کلکٹر ہوئے، ریٹائر ہوکر کچھ عرصہ ایک ریاست میں وزیر مال رہے ان کا بھی عرصہ ہوا انتقال ہوگیا۔ [3] یعنی انگریزی حکومت سے عدم تعاون کرنے والے۔ یہ تقریظ مولانا نے ۱۹۲۸ء میں لکھی تھی۔

اس مثنوی کے ابتدائی چند شعر تمہید کے سنئے ؎

قلمِ دو زباں دکھا جوہر — خامۂ دُرفشاں دکھا جوہر
وقت آیا ہے خوش بیانی کا — امتحاں آج ہے روانی کا
گُلِ مضمون رنگ دکھلائیں — آج کاغذ پہ پھول کھِل جائیں
لب پہ تحسین بار بار آئے — گلشنِ نظم میں بہار آئے
ہر ورق رشکِ سنبلستاں ہو — مثنوی غیرتِ گلستاں ہو
بحرِ مضموں میں ہو تلاطم آج — جوش میں آئے قلزمِ مواج
کس طرف ہیں سخن کے زمزمہ ساز — کھولتا ہوں درِ خزینۂ راز
عرصۂ نظم گھیرتا ہوں میں — آج موتی بکھیرتا ہوں میں
گوہرِ دُر کی کان ہے سینہ — جوہری کی دُکان ہے سینہ
تھے جو مضموں ازل سے سربستہ — ہیں مرے سامنے کمر بستہ
توسنِ فکر ہو جو گرم عناں — پردۂ غیب کے ہوں راز عیاں
پھر کے اک پل میں چار سو آئے — جب اُڑے آسماں کو چھو آئے

علی گڑھ کالج چھوڑنے کے بعد جب یہ سب حضرات اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے تو سید زین الدین مرحوم نے اپنے ایک خط میں اس کا شکوہ کیا تھا کہ اب ہمارے دوستوں نے دریافت حال کے لئے خط بھیجنے بھی ترک کر دئے ہیں۔ داؤد مرحوم نے جس منظوم قطعہ میں اس کا جواب دیا تھا وہ یہاں درج کرتا ہوں ؎

تم نے لکھا تھا مجھے خط میں بڑی حسرت سے — اور حقیقت میں وہ تھی بات بھی حسرت والی
یعنی جو روز[1] کی آخر میں ہوئی تھی حالت — اور جس قسم کی تھی اُس کی پریشاں حالی
کم زیادہ ہے وہی حال تمہارا کہ تم — جس طرف دیکھتے ہو پاتے ہو میداں خالی
لاکھ کوشش کرو، اب کوئی نہیں ملنے کا — محض بے سود، کرو کیسی ہی دیکھا بھالی
چودھری[2] کر گیا، سچ ہے، جو کچھ کرنا تھا — اس کی ہمت تھی قوی، حوصلے اس کے عالی
اب نہ وہ دم ہے کسی میں، نہ ہے وہ جوش و خروش — اور اِدھر تم پہ بھی ہے چھائی ہوئی کنگالی
یعنی خود تم کو ہے افسوس کہ اب تم میں کچھ — نہ رہی بات وہ لوگوں کو لبھانے والی
اب نہیں وہ کہ جسے چاہا اُسے پھونک دیا — گویا اک آگ تھی جب جی میں ہوا دھکالی
مل گیا گر کوئی بیچا رہ تو دل اینٹھ لیا — صبر و ہمت کی جو کچھ جمع تھی سب رکھوالی
ہو گئے ظلم میں جب طاق ستم میں اُستاد — خوب ان باتوں میں جب مشق بہم پہونچالی
تو یکایک صفِ عشاق سے نکلا آگے — اک اولوالعزم، جری، پانپتی کھرنالی
اس نے دو روز ہی میں کر دی قیامت برپا — ہو گئی دھوم زمانہ میں وہ ہلچل ڈالی

---

[1] اس زمانہ میں ایک ناول "روز فرڈیننڈ" انگریزی کا شایع ہوا تھا۔ روز ہیروئن کا نام تھا۔ [2] چودھری ممتاز حسین مرحوم جن کو اُن سے معاشقہ تھا۔ [3] اس زمانہ میں داؤد مرحوم علی گڑھ کالجیٹ اسکول میں ٹیچر تھے۔

اس کے تیور ہی کچھ ایسے تھے کہ دیکھے نہ بنے
پائی تھی اس نے طبیعت ہی عجب متوالی

اس کی اُلفت کے ہوئے لوگوں میں چرچے کیا کیا
مثنوی بھی کسی اُستاد نے اک لکھ ڈالی

تم بھی مشہور جہاں ہو گئے اسکے باعث
اور اس نے بھی کما حقہٗ شہرت پالی

اس زمانہ کے گزر جانے کا اب رنج فضول
ٹھہر سکتی نہیں جو شے ہو گزرنے والی

اب کوئی اور، اسی قسم کی سوچو تدبیر
شغل کچھ چاہئے اچھا نہیں رہنا خالی

ہم بتائیں تمھیں، اب اس پہ عمل کرنے لگو
"محبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی"

صاحب "خمخانۂ جاوید" نے داؤد مرحوم کا منتخبہ کلام درج کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "قدیم اور جدید دونوں شاہراہوں کے مالک تھے۔ ان کے اشعار سے خصوصاً "مرثیۂ یوسف خاں" سے ان کی غیر معمولی لیاقت، معاملہ بندی اور مضمون پسند فکر کا رنگ مترشح ہوتا ہے، حق یہ ہے کہ یہ مرثیہ اپنے رنگ میں فرد ہے۔ مولانا حالی کے اکثر اشعار کو تضمین کیا ہے۔ بلا کے ذکی اور ذہین تھے۔ ان کے کلام سے ان کی شوخی، طبیعت داری اور ذکاوت ٹپکتی ہے۔ اگر زندگی وفا کرتی تو کیا عجب کہ اس فن میں بھی نام و نمود حاصل کرتے۔"

اب چند شعر قدیم طرز کے بھی ملاحظہ ہوں۔ ۱۸۹۳ء میں ایک مشاعرہ بڑے اہتمام سے مراد آباد میں ہوا تھا۔ مصرعۂ طرح تھا "ہاتھ ملتا ہوا بالیں سے مسیحا اُٹھا" داؤد مرحوم خود تو شریک مشاعرہ نہ ہوئے، لوگوں کے اصرار سے طرحی غزل کہی جو اُن کے بڑے بھائی محمد ایوب صابر مرحوم نے پڑھی۔ اس کے بعض شعر سنئے ؎

جب پئے سیر چمن وہ گلِ رعنا اُٹھا
پائے بوسی کے لئے خواب سے سبزہ اُٹھا

بزم سے غیر کے اُٹھ جانے کی تشویش فضول
اس کا اب ذکر ہی کیا، جو کوئی اُٹھا اُٹھا

جب دمِ نزع مجھے پانوں رگڑتے دیکھا
"ہاتھ ملتا ہوا بالیں سے مسیحا اُٹھا"

میں نے جب وادیٔ غربت میں رکھا اپنا قدم
خار، پابوسی کی خاطر، بہ تمنا اُٹھا

قطعہ

پئے تسلیم درختوں نے جھکائیں شاخیں
میری تعظیم کو جنگل میں بگولہ اُٹھا

پیش کش خاک نے اکسیر کی، زر ذروں نے
کچھ نہ کچھ لے کے ہر اک ساکنِ صحرا اُٹھا

طرب و عیش کا سامان کیا تھا سبھا ری
کیا کہیں ابر ہی تقدیر سے ہلکا اُٹھا

شوقِ دیدار نے فرقت میں سزا دی اچھی
سینکڑوں بار میں بے چینی سے بیٹھا اُٹھا

ان کا مختصر کلام زیادہ تر اخلاقی نظموں پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک طویل نظم کو جس میں سو سے زاید شعر ہیں ان کے دوست اور رفیق خان بہادر حاجی محمد حبیب اللہ خاں صاحب بی۔ اے (علیگ) سابق کلکٹر و۔ پی نے ۱۸۹۲ء میں طبع کرا دیا تھا اور دیباچہ میں لکھا تھا کہ "یہ نظم ایسی اعلیٰ درجہ کی نفیس اور دلکش ہے کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے طالب علموں کی نظمیں تو درکنار ان کل نظموں میں جو اس طرزِ جدید میں (مولانا حالی کی نظموں کو مستثنیٰ کرکے) لکھی گئی ہیں بے مثل و لاثانی ہے۔" بخوف طوالت ان نظموں میں سے کسی نظم کو نمونتہً درج نہیں کر سکتا۔ مولانا حالی مرحوم کے متعدد اشعار کو تضمین کیا، جس میں سے ایک تضمین کو مولانا محمد علی جوہر نے اپنی تقریظ میں درج کیا ہے جو اوپر گزر چکی۔ ایک دو تضمینیں اور ملاحظہ ہوں:-

مولانا حالی کا شعر ہے ؎

نظر آتا ہے یہ پہلے ہی سے حالی انجام — یار کی میں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی

اس کی تضمین سنئے :-

اب تو داؤد کبھی لیں گے نہیں عشق کا نام — سامنے آئیں تو حضرت کو کروں جھک کے سلام
میں نے اول ہی کہا تھا کہ یہ ہے مکر تمام — نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے حالی انجام
یار کی میں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی ؟

شعر حالی ؎

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں — طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تضمین داؤد ؎

کل جو عدو نے بزم میں کیں بدزبانیاں — وہ آپ جانتے ہی ہیں، میں کیا کروں بیاں
اس سے تو مجھ کو کچھ بھی شکایت نہیں پہ ہاں — رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

آخر میں یہ بات بھی لکھ دینی ضرور ہے کہ لاہور کے رسالہ "الحمرا" ماہ نومبر ۵۵ء میں نثار احمد فاروقی کا جو مضمون داؤد صاحب مرحوم کے چھوٹے بھائی کے متعلق بعنوان "گدڑی کے لال — محمود احمد عباسی" شایع ہوا ہے اُس میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی کسی تحریر کے فقرے نقل کئے گئے ہیں جن میں مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ :-

"علی گڑھ کا ایک طالب علم داؤد نامی تھا۔ شاعری سے اُسے طبعی مناسبت تھی، اُس نے (مولانا حالی کی) غزل کی تضمین کی اور مقطع کی تضمین کچھ ایسی چسپاں واقع ہوئی گویا مقطع حالی کا نہیں رہا داؤد کا ہوگیا۔۔۔۔ خواجہ (حالی) صاحب نے اصرار کرکے داؤد کو بلوایا اور مجبور کیا کہ پوری تضمین سنائے۔ پھر تعریف کرکے اُس کا دل بڑھایا اور دیوان حالی درجۂ اول کا چھپا ہوا بطور صلہ کے عطا فرمایا اور کہا "یہی نسخہ ہے جو میں نے اپنے لئے رکھا تھا لیکن اس کا مستحق اپنے سے زیادہ نہیں سمجھتا ہوں۔ افسوس ہے اس طالب علم کا نوجوانی میں انتقال ہوگیا"

مولانا آزاد کو داؤد مرحوم کے حالات کی اطلاع صحیح نہیں ملی۔ تضمین کا واقعہ ۱۸۹۲ء کا ہے جب داؤد طالب علم نہیں بلکہ کالجیٹ اسکول میں ٹیچر تھے اور اس کے ایک عرصہ کے بعد جب وہ سرکاری ملازمت میں منسلک اور صاحبِ اولاد تھے بعمر تقریباً چالیس فوت ہوئے، اُن کے بارے میں یہ کہنا کہ "اس طالب علم کا نوجوانی میں انتقال ہوگیا" صحیح نہیں ہے — (ساقی)

قولِ فیصل

جس میں ملک کے مشہور مفکر و بلند خیال شاعر علی اختر اختر حیدر آبادی نے ثابت کیا ہے کہ انسان لاکھ ترقی کرے کتنی ہی عقل و فراست سے کام لے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کو خدا کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے، فنی حیثیت سے اختر کا یہ بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ ثبوت میں بآسانی پیش کیا جا سکتا ہے۔ شروع میں حضرت نیاز فتحپوری کا مقدمہ بھی شامل ہے۔

کاغذ ۲۸ پونڈ دبیز گرد پوش رنگین - قیمت دو روپیہ -

منیجر نگار لکھنؤ

دُنیا کا سب سے زیادہ خطرناک کھیل

مادی ترقیوں کے ساتھ ایک دوسرے سے بازی لے جانے (مسابقت) اور نام و نمود کا جذبہ بھی دنیا میں بڑھتا جا رہا ہے۔ اسوقت یہ جذبہ زندگی کے علمی و عملی دونوں پہلوؤں میں عام ہے اور اس پر نہ صرف دولت بلکہ جان دینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

اس سے قبل تفریحی مشاغل میں سب سے زیادہ دلچسپی گھوڑ دوڑ سے لی جاتی تھی، لیکن اب جانوروں سے گزر کر متحرک مشینوں تک پہونچ گئی ہے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ توجہ موٹروں کی دوڑ نے حاصل کرلی ہے، جو دنیا کا سب سے زیادہ خطرناک اور قیمتی کھیل سمجھا جاتا ہے اور جس کثرت سے لوگ اس کا تماشہ کرتے ہیں دُنیا کے کسی کھیل کا نہیں کرتے۔

سلور اسٹون کی بین الاقوامی دوڑ میں عموماً ایک لاکھ سے زیادہ تماشائیوں کا ہجوم ہوتا ہے اور جب پچھلے جون میں لی مان (فرانس) اس تفریح کا مرکز تھا تو ڈھائی لاکھ انسانوں نے اس میں حصہ لیا اور ۸۰ جانیں ضایع ہوئیں۔ جرمنی میں بمقام نربرگنگ اس میں ۵ لاکھ انسانوں نے اس میں حصّہ لیا اور اٹلی کی ایک ہزار میل کی دوڑ دیکھنے ۵۰ لاکھ تماشائی جمع ہوئے۔

مغربی یوروپ میں گرانڈ پرکس کی دوڑ ہوتی ہے اور جو شخص ان میں سے نو دوڑ جیتنے کے ساتھ ہی انڈیا پولس اور بیونسرس کی دوڑ میں بھی اول آئے وہ دنیا کا چمپین قرار پاتا ہے۔

گرانڈ پرکس کی دوڑ عموماً ۳۰۰ میل کی ہوتی ہے اور یہ راستہ شہر سے باہر گاؤں کے اونچے نیچے حصّوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ نربرگرگ کی دوڑ ۱۴ میل کی ہوتی ہے اور اس کا راستہ بہت زیادہ اونچا نیچا، ٹیڑھا میڑھا ہوتا ہے۔ ان دوڑوں میں جو موٹر شریک ہوتی ہے اس کا وزن ۱۵ ہنڈرڈ ویٹ (تقریباً ۱۴ من) سے زیادہ نہیں ہوتا اور اس پر کوئی اور وزنی چیز نہیں رکھی جاتی یہ موٹریں خاص طور پر بہت مضبوط بنائی جاتی ہیں۔ ان کے ٹایر بھی خاص قسم کے ہوتے ہیں اور ان کی قیمت بھی معمولی ٹائروں سے دوچند ہوتی ہے۔ ہر موٹر کے ساتھ دو جوڑ ٹایر کے ہوتے ہیں، کیونکہ میگنریکو کے کوہستانی راستوں میں نیا ٹایر ۷۰ میل میں تار تار ہو جاتا ہے۔ ان کے بریک کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ وہ گرم نہ ہونے پائے پھر بھی اس کی پیکنگ جل جاتی ہے، لمبی دوڑ میں جلد جلد بریک لگانا پڑتا ہے اور اس کی رگڑ اتنی سخت ہوتی ہے کہ جس بریک کو معمولاً ایک سال میں خراب ہونا چاہئے وہ تین میل کے اندر گھس جاتا ہے اور بریک ہی خاص چیز ہے جس کے بغیر کوئی ڈرائیور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہر چند بعض ایسے ماہر دیکھے گئے ہیں جو ساری دوڑ بغیر بریک استعمال کئے محض گیر کی مدد سے ختم کر دیتے ہیں۔

ان کے پلگ معمولی گاڑیوں کے پلگ سے سہ چند زیادہ قیمتی ہوتے ہیں اور اتنی ہی جلد گھس جاتے ہیں۔ پٹرول ان کا خاص قسم کا ہوتا ہے جس میں متعدد کیمیاوی قیمتی اجزاء شامل کئے جاتے ہیں اور ۸ میل میں ایک گیلن صرف ہو جاتا ہے۔

موٹر چلانے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اگر کوئی ڈرائیور اپنی گاڑی کی قوت کا صحیح اندازہ کئے بغیر چلاتا ہے تو ۲۵ میل کے اندر ہی اندر وہ بیکار ہو جاتی ہے چنانچہ رھیس کی دوڑ میں ایک بار ۲۲ گاڑیوں میں سے صرف چار گاڑیاں منزل تک پہونچیں۔

دوڑ کا منظر بڑا دلکش منظر ہوتا ہے۔ موٹر انجنوں کا شور، لاؤڈ اسپیکروں کی چیخ پکار، مختلف ملکوں کی جھنڈیوں کا

قطار اندر قطار لہرانا، تماشائیوں کا ہجوم، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑا کارنوال آگیا ہے۔

لیمان کے میدان میں ۲۴ گھنٹوں کے اندر وہاں کے تماشائیوں نے ۳۰ لاکھ ڈالر صرف کردئے۔ یہاں دس رسٹراں تھے، اور تیس آبدارخانے جہاں کھانے پینے کے علاوہ رقص وسرود کا بھی انتظام تھا۔ ۲۰ ہزار موٹریں تماشائیوں کی تھیں اور سو جہاز ہوائی اڈے پر۔ خیموں اور چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہاں ایک ہزار پولیس کے سپاہی، گیارہ عارضی اسپتال ۴۰ ڈاکٹر اور دس امبولنس گاڑیاں ہر وقت طیار رہتی تھیں۔

دوڑ شروع ہونے سے قبل لوگوں میں بڑا ہیجان ہوتا ہے۔ میکانک موٹروں کی دیکھ بھال میں لگے ہوتے ہیں اور ڈرائیور اپنا آخری سگریٹ پینے میں۔ اس کے بعد مکانک موٹروں کو ڈھکیل کر آگے بڑھاتے ہیں اور ڈرائیور ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ موٹریں اپنی اپنی متعینہ جگہوں پر ایک قطار میں کھڑی کردی جاتی ہیں۔ ڈرائیور تسموں سے اپنے آپ کو سیٹ کے ساتھ کس لیتے ہیں۔ اس کے بعد کلچ پر پاؤں رکھ کر ڈرائیور طیار ہوجاتے ہیں، انجن اسٹارٹ کیا جاتا ہے اور جھنڈی گرنے کے ساتھ ہی وہ توپ کے گولہ کی طرح چل پڑتی ہیں اور ایک سکنڈ کے اندر ہی پہلی ہی اسپیڈ میں سو میل فی گھنٹہ کی رفتار پکڑ لیتی ہیں۔ ان موٹروں میں پانچ گیر ہوتے ہیں اور ہر گیر کی تبدیلی سے رفتار بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ کئی سو میل تک پہونچ جاتی ہے۔ اول اول تو تمام موٹریں گڈمڈ ہوجاتی ہیں لیکن پھر یکے بعد دیگرے آگے پیچھے ہوکر آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ دوڑ میں سب سے خطرناک مقامات جہاں اکثر موٹریں اُلٹ جاتی ہیں، راستے کے موڑ ہیں اور انھیں سے سلامت گزر جانا اصل کامیابی ہے۔ ان کی رفتار بے پناہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ۳۵ سکنڈ میں ۳۰ گیلن پٹرول صرف کردیتی ہیں۔

اس دوڑ میں شریک ہونے والے ڈرائیور برسوں پہلے اس کی طیاریاں کرتے ہیں اور ورزش کی قسم کا کوئی مشغلہ ایسا نہیں ہے جس کی انتہائی مشق نہ کرتے ہوں، کیونکہ چند منٹ کی دوڑ میں ان کے اعصاب و دماغ پر اتنا سخت اثر ہوتا ہے کہ جب تک وہ پہلے سے اپنے آپ کو طیار نہ کرلیں اس کی برداشت کر ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ ۳۰۰ میل کی ایک دوڑ میں جو چند منٹوں میں ختم ہوجاتی ہے، کم از کم ہر ڈرائیور کا وزن دس پونڈ کم ہوجاتا ہے۔

دُنیا آیندہ ۲۵ سال میں

تاریخ انسانی کی وسعت کے لحاظ سے صدیاں بھی چند سکنڈ کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن اس قلیل وقفہ میں تاریخ نہ جانے کتنے اوراق اُلٹ دیتی ہے اور دُنیا کہاں سے کہاں پہونچ جاتی ہے — پچھلی صدی میں انسان نے جو ترقیاں کی ہیں وہ قبل کی صدیوں کے لحاظ سے بہت نمایاں ہیں۔ بجلی پر قابو پالینا، جراثیم کی دریافت، نئے مخدرات (سن کرنے والی ادویہ) کا اکتشاف، بڑے پیمانہ پر صنعت وحرفت کی تشکیل، برقپاروں (ELECTRONICS) کی توسیع اور آٹم کا تجزیہ، یہ تمام باتیں اسی صدی کی ہیں اور نہایت تیزی کے ساتھ ہمارے سامنے آرہی ہیں، لیکن یہ خیال کرنا کہ اس کے بعد زمانہ شاید سانس لینے کے لئے کچھ عرصہ تک ٹھہر جائے گا صحیح نہ ہوگا، بلکہ برقپاروں اور آٹم کے تجزیہ نے حالات اتنے بدلدئے ہیں اور ترقی کا اتنا زبردست سیلاب سامنے ہے کہ آیندہ ۲۵ سال میں شاید انسان کو سانس لینے کی بھی فرصت نہ ملے اور دُنیا صدیوں کی علمی وصنعتی وحرفتی ترقیوں کو آیندہ ایک ربع صدی میں اپنے اندر سمیٹ لے۔

پہلے انسان صرف تصور سے کام لے کر طرح طرح کی آرزوئیں پیدا کرتا تھا اور ان کو ناممکن سمجھ کر خاموش ہوجاتا تھا، لیکن آج سائنس کی ترقی اور خصوصیت کے ساتھ آٹم (جوہر فرد) پر قابو پالینے کے بعد ہماری مشکل ترین تمنائیں بھی ناممکن الحصول نہیں ہیں

یہاں تک کہ دوسرے سیاروں تک پہونچ جانا بھی اب محال نہیں رہا۔

جب ۱۹۵۱ء میں امریکہ کے ریڈیو کارپوریشن کی ۴۵ ویں برسی منائی گئی تو اس کے صدر ڈیوڈ سرناف نے سائنس دانوں سے کہا میں چاہتا ہوں کہ جب آیندہ ۵۶ء میں پچاسویں برسی منائی جائے تو آپ تین تحفے مجھے دیں ایک ٹیلی ویژن کا برقی "TAPE - RECORDER" دوسرے ہوا کو برقپاروں سے ٹھنڈا کر دینے والا آلہ، اور تیسرے لاؤڈ اسپیکر کی طرح روشنی کو بھی بڑھا دینے کا کوئی خاص طریقہ۔ یہ سنکر سائنس داں مسکرائے لیکن دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ ٹیپ ریکارڈر تو انھوں نے طیار کر لیا اور باقی دو چیزیں بھی غالباً ۵۶ء تک ہمارے سامنے آجائیں گی، کیونکہ وہ روشنی کو ۲۰ گنا بڑھانے میں تو کامیاب ہو گئے ہیں اور جب وہ اس کو سو گنا کر لیں گے تو پھر دوکانوں، مکانوں کو روشن کرنے کا طریقہ بالکل بدل جائے گا، نہ بجلی کے تاروں کی ضرورت ہوگی نہ کانچ کے قمقموں کی اور ہم تاریکی میں بھی بہ آسانی دیکھ سکیں گے۔ الغرض آٹمی قوت کی دریافت نے ایک بڑا حجاب علم کے سامنے سے ہٹا دیا ہے اور یقین کیا جاتا ہے کہ ۱۹۸۰ء تک دُنیا کا تمام موجودہ صنعتی نظام بالکل بدل جائے گا۔ جہاز، طیارے، انجن، موٹر کار سب آٹمی قوت سے چلنے لگیں گے بھاپ اور بجلی کے انجن ختم ہو جائیں گے، اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک ڈاک اور مال و اسباب وغیرہ آناً فاناً اسی قوت سے منتقل کیا جاسکے گا ہوائی جہازوں کے پرے کے بغیر ہوابازوں کے فضا میں ہر جگہ اُڑتے نظر آئیں گے اور خشکی کے تمام راستے فضائی راستوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس وقت تک بھاپ اور بجلی سے قوت حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی مشینوں، عمارتوں، ایندھن کے ذخیروں اور تاروں کی ضرورت ہوتی تھی، لیکن اب ان کی کوئی ضرورت نہ ہوگی اور صرف ایک چھوٹے سے بکس کے اندر بند کی ہوئی آٹمی قوت سے سب کچھ ہو سکے گا۔

اسی کے ساتھ آفتاب، پانی اور ہوا کے اندر چھپے ہوئے جتنے ذخائر قوت پائے جاتے ہیں، ان پر بھی انسان کی دسترس ہو جائیگی اور اس طرح انسان کی ترقی کا وہ دور شروع ہوگا جس کا صحیح تصور بھی اس وقت مشکل ہے۔ سمندر کے پانی کو شیریں بنا کر ریگستانوں کو گلزار بنا دیا جائے گا اور سمندر کی تہوں سے تمام پوشیدہ کیمیائی و غذائی عناصر حاصل کر کے دُنیا کو مالا مال کر دیا جائے گا۔

امراض کی تشخیص و علاج اور سرجری میں آٹمی قوت سے کام لیا جانا شروع ہو گیا ہے لیکن ۱۹۸۰ء تک اس میں اتنی ترقی ہو جائیگی کہ سرطان اور دق وغیرہ ایسے تمام ناممکن العلاج امراض، معمولی بیماریوں کی طرح علاج پذیر ہو جائیں گے اور انسانی عمر کے اوسط میں دس پندرہ سال کا اضافہ ہو جائے گا۔

یہ دور ایسی مشینوں کا ہے جو از خود تمام کام کریں اور انسانوں کی ضرورت نہ ہو اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اب لوگوں کو اپنے اعصاب سے نہیں بلکہ دماغ سے زیادہ کام لینا ہوگا۔ کام کا ہفتہ مختصر ہو جائے گا اور فرصت و فراغ کی وجہ سے جمالیاتی فنون پر زیادہ متوجہ ہونے کا موقع ملے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت بھی صنعت و حرفت کی ترقیاں اس حد تک پہونچ گئی ہیں کہ مصنوعات کی کثرت نے ان کی کھپت کا اہم سوال پیدا کر دیا ہے اور آیندہ مزید ترقیوں کے ساتھ یہ سوال اور زیادہ پیچیدہ ہو جائے گا اور شاید یہی وہ وقت ہوگا جب دُنیا کی بازار میں لین دین کے مسئلہ پر ڈالر اور روپیہ کو سامنے رکھ کر غور نہ کیا جائے گا بلکہ دُنیا کی مختلف آبادیوں کے پیشِ نظر اس کو طے کیا جائے گا، جو ممکن ہے کسی وقت ساری دُنیا میں صرف ایک حکومت کے قیام کا باعث ہو جائے اور اس طرح جنگ کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

لیکن اگر بدقسمتی سے آٹمی قوت سے کام لینے کا رجحان بدل گیا اور امن و سکون کی راہوں کی جگہ بغض و عناد اور اختلاف و تصادم کی راہیں اختیار کی گئیں تو پھر جس طرح اس وقت ہم ساری دُنیا میں کسی ایک صلح کوشش حکومت کا خواب دیکھ رہے ہیں، اسی طرح اس وقت ہم یہ سوچیں گے کہ اس دُنیا کو جسے خود ہم نے اپنے ہاتھوں جھلس کر رکھدیا ہے، دوبارہ کیونکر آباد کیا جاسکتا ہے اور چند نفوس جو باقی رہ گئے ہیں وہ کرۂ ارض کی ۲۴ ہزار میل کی وسعت میں کس گوشہ میں رہنا پسند کریں گے۔

خمیازہ

(فضا ابن فیضی)

ثبات دامن کی تازہ دشتی کمھلائی جاتی ہے
وہی چنگیز کی تاریخ پھر دُہرائی جاتی ہے

بجھادی وقت نے کتنے سمن زاروں کی برنائی
ہوائے بوئے گل اہلِ چمن کو خود نہ راس آئی
چمکتی ہے مئی کی دوپہر نوخیز پھولوں پر
مگر سائے کا لطفِ خاص ہے خونی ببولوں پر
خزاں ہے فتنہ ساماں موسمِ گل کے لباسوں میں
یہ ہیں شبنم کے آنسو پھول کے رنگیں گلاسوں میں
وضو کرتے ہیں اپنے ہی جگر کے خون سے لالے
چمن آشوبیوں کی حد تک آ پہونچے چمن والے
ابھی آنکھیں نہیں کھولیں جمال صبح گاہی نے
لیا ہے چاند کو اپنے تصرف میں سیاہی نے
ازل سے مبتلا ہیں رفعتیں آزارِ پستی میں
نہیں معلوم کتنے چاک ہیں دامانِ ہستی میں
یقیں کی شمع کشتہ، آگہی کا سوزِ افسردہ
ہر اک شعلہ ہے شاید گلخنِ ہستی کا نم خوردہ
اُبلتے ہیں نشاطِ کفر کے نشئے ایاغوں سے
یہ محفل ہے تہی ایمان و حکمت کے چراغوں سے
غبارِ کس مپرسی ہے ابھی کتنی جبینوں پر،
نہ پوچھو کس قدر مہتاب کمھلائے زمینوں پر
سلگ اُٹھے ہیں سوزِ جہل سے دامن نگاہوں کے
کہ ہیں شعلہ بہ پیراہن نشیمن خانقاہوں کے
تمدن کی خدائی، ملتوں کی قہرسامانی،
سفینوں کی پذیرائی پہ آمادہ ہے طغیانی
عروسِ گل نے کانٹے نذر میں پائے بہاروں سے
میں باز آیا تری دنیا کے ان رنگیں نظاروں سے

ستاروں کا لہو ہے صبح کے رخسار کا غازہ
نہ جانے کس قدر ناسور ہیں مرہم کا خمیازہ

انتخاب کلام

(ابو محمد سحر بھوپالی)

اک نظارہ اک تبسم اک اشارہ ایک بات — ہائے وہ لمحے کہ جن کو جاوداں سمجھا کئے
غلط ہے غیر پہ تہمت ہنسی اُڑانے کی — خود اپنے حال پہ ہم مسکرائے ہیں کیا کیا
گمانِ محض تھا امید ہو کہ نومیدی — فریب اہلِ تمنا نے کھائے ہیں کیا کیا

جور و ستم پر ہنسنے والے لطف و کرم پر رو نہ سکیں گے — میں جو سنا دوں اپنا فسانہ اس کی گلی میں کوئی نہ جائے
دل وہ سحر کیا دل ہے کہ جس میں رہ گئی حسرتِ ناکامی کی — کتنی ہے ظالم وہ بھی تمنا ہو کے جو پوری خون رلائے

ایک بے نام سی اُلجھن ہے دل و جاں پہ محیط — ایک گمنام سا احساس زیاں آج بھی ہے
ترکِ اُلفت میں بھی اُلفت کے نشاں باقی ہیں — قافلہ لُٹ کے تری سمت رواں آج بھی ہے

آپ نے سعیِ کرم کی آپ گھبرائیں نہیں — میری آنکھیں تو وفورِ شوق سے نم ہو گئیں
وہ بہارِ صد بہاراں سامنے کیا آ گیا — فکر کی رنگینیاں گویا مجسّم ہو گئیں

کہاں یہ ہوش کہ کچھ اہتمام ہم کرتے — یہ بام و در ترے آنے سے جگمگائے ہیں
جگہ ملی نہ کہیں جن کو اشکباری کی — وہ تیری بزم میں آئے تو مسکرائے ہیں
بس اک نگاہِ نازِ اُٹھنے کی دیر تھی — ہم انجمن میں بھول گئے انجمن کی بات

حدیثِ میکدہ

(عزیز)

یہ دولت و جاہ و کامرانی - کیا ہے — پیغامِ بہار و گلفشانی - کیا ہے
ہو عمرِ خضر بھی گر میسّر تو عزیز — بے بادہ و جام - زندگانی - کیا ہے

افکار سے دل نے کب فراغت پائی — اک ساعتِ نیک، سو مصیبت لائی
کوثر کی امید کس بھروسے پہ عزیز — دُنیا میں - شراب کب میسر آئی

ہر چیز وہاں کی - اختیاری ہو گی — حوروں کے جلو میں - بادہ خواری ہو گی
جس مے کو - حرام کہہ رہا ہے - واعظ — جنّت میں - اُسی کی نہر جاری ہو گی

ہر چیز یہاں کی - اک خیالی گذری — کیا غم - جو حیات - لا اُبالی گزری
اُس - ساعتِ زندگی پہ حسرت ہے عزیز — جو صحبتِ میکدہ سے خالی گزری

جذبات میں - التہاب - آ جاتا ہے — سننے کو کہے - شباب آ جاتا ہے
ساغر کو لبوں سے جب لگاتا ہوں عزیز — رگ رگ میں - اک انقلاب آ جاتا ہے

نوائے درد

(عبداللہ ہلال صدیقی)

فضائے جانفزا کا ذکر مجھ سے تو نہ کر ہمدم
یہ گلکاری چمن کی میرے خوں کی لالہ زاری ہے
نگاہیں جس طرف اُٹھتی ہیں اک حسرت برستی ہے
مجھے اے کاش دم بھر بھی سکونِ قلب مل جاتا
میں سنتا تھا کبھی غربت بھی راس آتی ہے راہی کو
یہاں کے بحر میں پایا نہ میں نے لولوئے لالہ
الٰہی کیا سمجھ کر آہ میں نے کی تھی غوّاصی
کبھی میرے جنوں نے ایک ذرّہ کو بہت جانا
خرد میں حوصلہ کب تھا بنائے گلستاں کرتی
اشارہ عقل کرتی ہے چمن پر تو قناعت کر
غضب ہے میں کہاں اپنا دلِ درد آشنا لایا
کہ میری صبح غربت بھی مثال شامِ اُداس آئی
مری ویرانیوں نے بخش دی پھولوں کو رعنائی
مری تقدیر یارب کھینچ کر مجھ کو کہاں لائی
حکومت کا تمنائی نہ میں دولت کا سودائی
وطن جب چھوڑ کر دیکھا تو غربت کی سزا پائی
نہ اس کی موج ساحل تک کبھی پہونچی نہ ٹکرائی
سمندر کی ہے پایابی نہ دریا کی ہے گہرائی
کبھی میرے جنوں پر تنگ صحرا کی بھی پہنائی
چمن بندی ہے صحرا کی جنوں کی کارفرمائی
جنوں کہتا ہے باقی ہے ابھی کچھ دشت پیمائی
فضائے درد افزا ہے نہ آثارِ مسیحائی

بادہ گساراں!

(غنی اعظمی)

ساحلِ دریا، صحنِ گلستاں
لالۂ و نسریں، سبزۂ و ریحاں
جمع ہوئے تفریح کے ساماں
آگئی لو وہ فصلِ بہاراں
بادہ گساراں! بادہ گساراں!

چاندنی شب، دریا کا کنارا
مست و رواں برسات کا دھارا
کس نے مجھے مستی میں پکارا
آگئی لو وہ فصلِ بہاراں
بادہ گساراں! بادہ گساراں!

عارض پر گلگونۂ مستی
آنکھ میں رنگِ بادۂ مستی
گریۂ مینا، خندۂ مستی
آگئی لو وہ فصلِ بہاراں
بادہ گساراں! بادہ گساراں!

بادل اتنا جھوم کے برسا
ڈوب گئے میخانۂ و مینا
مستی ارزاں، نشہ سستا
آگئی لو وہ فصلِ بہاراں
بادہ گساراں! بادہ گساراں!

مطبوعات موصولہ

آسٹریلیا کی جھلک سفرنامہ ہے تاج سلطانہ بیگم حیدر آبادی کا جو اپنے شوہر میر یاسین علی خاں انجینیر کے ساتھ آسٹریلیا گئی تھیں - یوروپ کے سفرنامے تو اکثر دیکھنے میں آئے، لیکن آسٹریلیا کا یہ غالباً سب سے پہلا سیاحت نامہ ہے جو اُردو میں شایع ہوا ہے - تاج سلطانہ اس سے قبل کئی بار یوروپ کا سفر کر چکی ہیں اور ان فرائض سے بخوبی آگاہ ہیں جو ایک سیاحت نگار پر عاید ہوتے ہیں، چنانچہ اس سیاحت میں انھوں نے تاریخی، آثاری، تجارتی، صنعتی و سماجی تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں - زبان و اندازِ بیان بھی کافی دلکش ہے - چونکہ آسٹریلیا کے متعلق ہماری معلومات کم ہیں اس لئے اس کتاب کی اشاعت یقیناً افادہ سے خالی نہیں اور وہ حضرات جو اس نوع کے معلوماتی تصانیف سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس میں دلچسپی کا کافی سامان موجود ہے -

ضخامت ۴، ۲ صفحات - قیمت دو روپیہ آٹھ آنے - ملنے کا پتہ :- الہدیٰ بک ایجنسی حیدر آباد -

ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل مجموعۂ مضامین ہے جناب سیف فیض بدرالدین طیب جی کا جسے رائٹرس امپوریم بمبئی نے شایع کیا ہے - فاضل مصنف بدرالدین طیب جی کے اخلاف میں سے ہیں، جنھوں نے بمبئی میں انجمن اسلام کا ادارہ قایم کرکے بڑی گرانقدر خدمات ملک و قوم کی انجام دیں - خود فاضل مصنف بھی مشہور ریاضی داں، مقنن اور پرجوش تعلیمی و سماجی کارکن ہیں، انھوں نے ان مضامین میں مسلمانوں کے اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی نصب العین پر نہایت ماہرانہ نگاہ ڈالی ہے اور یہ بھی ظاہر کیا ہے مسلمان ان عظیم مقاصد کو کیونکر حاصل کر سکتے ہیں، اخیر میں انھوں نے موجودہ کانگرس حکومت کی ضرورت و افادیت پر بھی اظہار خیال کیا ہے جو بہت سلجھی ہوئی منطق کا نتیجہ ہے - ضخامت ۵۶ صفحات - قیمت ۵ر

اسلام اور غیر مسلم سلسلۂ مطبوعات مسلم اکاڈیمی کی یہ چوتھی کتاب ہے جو تیسری بار شایع ہوئی ہے - اس کے مولف مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب صوبۂ بہار کے مشہور مصنف و اہلِ قلم ہیں جو اسلامی موضوعات پر اکثر و بیشتر مفید کتابیں لکھتے رہتے ہیں -

اس کتاب میں انھوں نے نہایت صحیح تاریخی واقعات جمع کرکے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ حد درجہ روادارانہ سلوک کیا ہے - اس کتاب میں عہد نبوی سے لیکر سلاطین ہند کی تاریخ تک کا جایزہ لے کر اسلامی صلح پسندی و امن کوشی پر روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلہ میں بہت سے غیر مسلم اکابر علم و ادب کی رائیں بھی پیش کر دی ہیں -

یہ کتاب اپنے مقصد کے لحاظ سے نہایت مفید اور ترتیب کے لحاظ سے بڑی مکمل تصنیف ہے - ضخامت ۲۵۶ صفحات - قیمت ۸ر - ملنے کا پتہ :- مسلم اکاڈیمی پھلواری شریف پٹنہ -

حیات امیر خسرو تالیف ہے خان بہادر نقی محمد خاں خورجوی کی جسے ادارۂ الشجاع نے کراچی سے شایع کیا ہے - ضخامت ۲۱۲ صفحات - سائز کتابی، طباعت کتابت معمولی - قیمت دو روپیہ بارہ آنے - ملنے کا پتہ :- ٹائمس پریس - صدر کراچی -

امیر خسرو سرزمین ہند کے ایسے جامع کمالات فرزند تھے کہ ان کا مثل کوئی دوسرا پیدا نہ ہو سکا - وہ نہ صرف فارسی و ہندی

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول)

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی، تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط، قیمت بارہ آنہ (علاوہ محصول)

مالہ وما علیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں اور اس کا ثبوت انھوں نے دور حاضر کے بعض اکابر شعراء مثلاً جوش، جگر، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے۔ ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے، قیمت ۸ آنہ

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشا، غالبہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے، عار (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دیا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے، قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات

حضرت فراق کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اردو غزل گوئی پر عصر یہ عصر ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون ادبیہ حقیقت نگاری، قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

فراست الید

اسکے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی پر پیشگوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

REGD.N.A-966 رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(اوسن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے، اوسن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے ۶/

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم و ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ ۶/ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے درخشاں کو نہ بھول جائیے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر جس میں تقریباً بیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کیے گئے ہیں اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں ٹارس ہنڈی کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے۔ جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء حسرت نمبر

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ محصول)

جنوری، فروری ۱۹۵۳ء

اداریہ نمبر جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور، حیدرآباد کے زمانے کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(فرماں روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپے ۸/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) یہ سلسلہ تتمہ۔ جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ ہے (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ